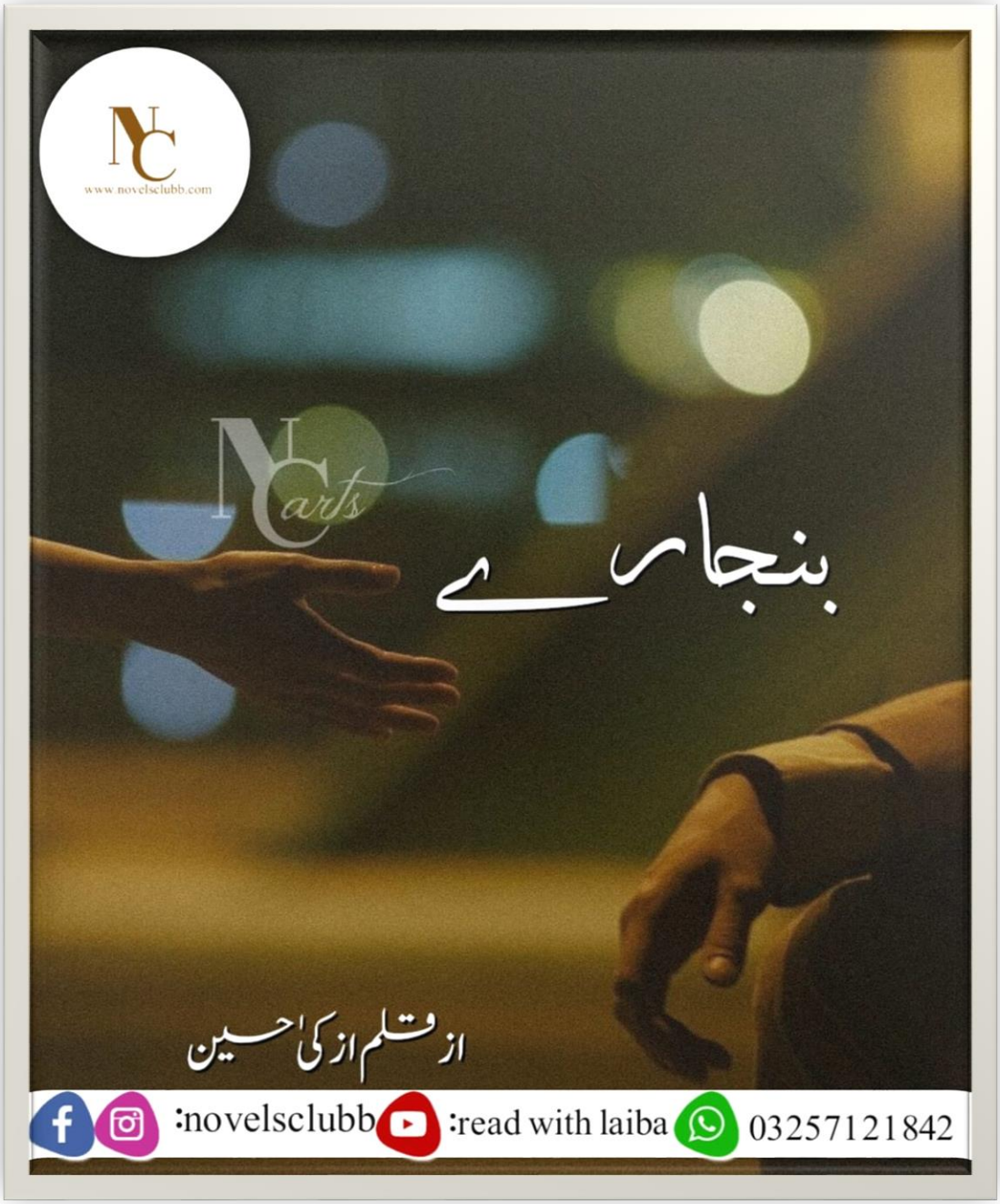
www.novelsclubb.com
بنجارے
از قلم از کی احسین
:novelsclubb
:read with laiba
03257121842

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول،افسانہ،شاعری، ناولٹ،کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک،انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP:

03257121842

بنجارے

از قلم

از کی حسین

www.novelsclubb.com

بنجارے (از کیٰ حسین)

باب سوم:

"تلاشِ لاحاصل" (حصہ اول)

(موجودہ دن سے ایک سال پہلے۔)

(شہزادی ساشا کی جلاوطنی سے چند ہفتے قبل۔)

رُخارا۔

یہ منظر قدرتی طور پہ ملک رمالیہ کے سب سے زیادہ حسین شہر رُخارا کا تھا۔ جو مضافات میں موجود اپنے حسین پھولوں اور ہرے بھرے گھاس کے میدانوں کی وجہ سے رُخارا کہلاتا تھا۔ خزاں کے موسم میں رُخارا سے زیادہ سنہری اور بہار کے موسم میں رُخارا سے زیادہ سرسبز و رنگین کوئی دوسرا شہر نہیں ہوتا تھا۔ آج کل وہاں خزاں کا موسم چل رہا تھا جس کے باعث سرسبز گھاس خشک ہو کے سونے جیسی سنہری دکھائی دینے لگی تھی۔

رمالیہ مشرقِ وسطی کا محفوظ ترین ملک تصور کیا جاتا تھا۔ اور رُخارا کو رمالیہ کا سب

سے زیادہ محفوظ شہر سمجھا جاتا تھا۔یہی وجہ تھی کہ رُخارا کے گرد کوئی لمبی چوڑی فصیل بھی تعمیر نہیں تھی۔ محض سنہری اور سرسبز کھیت تھے جو شہر کی خوبصورتی کو چار چاند لگاتے تھے۔

شہر کے شمال میں کسی پہاڑ کی طرح کھڑے سلطان خالد کے زمرد اور سفید رنگ کے محل میں بنے رہائشی حجروں کی طرف آؤ تو ایک بڑے سے کمرے میں مطالعے میز کے گرد بیٹھی شہزادی ساشابنتِ خالد کسی خط کو پڑھ رہی تھی۔ ویسے ہی بہت سے خطوط اس کے سامنے میز پہ بکھرے تھے۔ پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ انہیں خطوط کو پڑھنے میں مصروف تھی۔وہ قدرے امید سے ہر خط کو کھولتی مگر آخر تک پڑھنے تک اس کا چہرہ مایوسی سے بجھ جاتا۔ بالکل موتیے کے پھولوں والی ان تین موم بتیوں کی طرح جنہیں اس نے تھوڑی دیر قبل ہی پھونک مار کے بجھا دیا تھا۔البتہ سانس لینے پر فضا اب بھی خوشبودار محسوس ہوتی تھی۔

اچانک دستک کی آواز پہ اس نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

"سلام شہزادی۔"

اس نے سر کو خم دے کر ہاتھ سے خادمہ کو بولنے کا اشارہ کیا۔

"شہزادی سلطان عزیز خالد نے آپ کو اپنے کمرے میں طلب کیا ہے۔" خادمہ کی گردن ہنوز جھکی تھی۔

"تم جاؤ۔ میں آتی ہوں۔" خادمہ کو برخاست کرنے کے بعد اس نے ایک تھکی ہوئی سی سانس لی۔

وہ اٹھ کر سنگھار میز کے قریب آئی اور سبز آنکھیں اٹھا کے آئینے میں نظر آتا اپنا عکس دیکھا۔ وہ سفید رنگ کے آدھے آستینوں والے کامدار لباس میں ملبوس تھی جو پاؤں تک جاتا تھا۔ اس کے اوپر اس نے سنہری رنگ کی چھوٹی سی جیکٹ پہن رکھی تھی، جس پر جگہ جگہ سیاہ موتی اور ستارے لگے تھے۔ سرخی مائل بھورے بال دونوں کندھوں سے آگے گر رہے تھے۔ اور پیشانی پر سفید ننھے ہیروں والی ماتھا پٹی جھلک رہی تھی۔ گلے، کانوں اور کلائیوں پر بھی مختلف زیور سجا تھا۔

اس نے بالوں کو سمیٹ کر ڈھیلی سی چٹیا میں باندھا۔ اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ راہداری میں چلتے ہوئے اس نے نظر دونوں اطراف میں دوڑائی۔ محل کا یہ

حصہ شاہی خاندان کے افراد کی رہائش گاہ کے طور پہ استعمال ہوتا تھا۔ یہاں اکثر اوقات مکمل سکوت ہی چھایا رہتا تھا۔

وہ راہداری کے آخر میں بنے کمرے کے پاس گئی اور دروازہ کھلا ہونے کے باوجود دستک دی۔ اجازت ملنے پر اس نے قدم اندر رکھے۔

یہ رمالیہ کے عزیز ترین سلطان، خالد بن جہانگیر کا کمرہ تھا۔ اس کے باپ کی عالی شان رہائش گاہ۔

کمرے کی تین دیواریں حسین قدرتی مناظر کی تصویروں سے آراستہ تھیں۔ ایک تصویر مرحومہ سلطانہ کی بھی تھی جو باقی سب تصویروں میں نمایاں نظر آتی تھی۔ چوتھی دیوار میں بالکونی میں جانے کا راستہ تھا۔ فی الحال اس کے آگے سفید پردے آئے ہوئے تھے۔ جن میں سے چھن کے آتی سورج کی روشنی اندر داخل ہو رہی تھی۔ سونے کا حصہ ذرا ہٹ کر تھا جسے وقتی طور پر دوں سے ڈھکا گیا تھا۔

کمرے میں جگہ جگہ پڑے لوہے کے سٹینڈز میں موم بتیاں جل رہی تھیں۔ ساشا کے کمرے سمیت، شاہی خاندان کے سبھی لوگوں کے کمروں کی اندرونی سجاوٹ

ایسی ہی تھی۔

وہ اندر آئی تو وہ کمرے کے وسط میں بچھے لمبے چوڑے صوفوں میں سے ایک پہ براجمان تھے۔اسے دیکھ کر اپنی نشست سے اٹھے اور سر کو خم دے کے اس کی موجودگی کو سراہا۔ساشا نے بھی احتراماً سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

سلطان خالد ایک درمیانی عمر کے مرد تھے۔سر کے اکثر بال سفید ہو چکے تھے۔ مگر عمر کے اس حصے میں بھی وہ انتہائی باوقار اور وجیہہ شخصیت کے حامل تھے۔

وہ قریب آئی تو وہ مسکرائے۔ساشا نہیں مسکرائی۔وہ ان کے سامنے والے صوفے پر جا کے بیٹھ گئی۔

خادم وسط میں پڑے میز پر کھانے پینے کے کچھ لوازمات رکھ کر باہر چلا گیا۔اب وہ دونوں باپ بیٹی ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔ان کے بیچ خاموشی حائل تھی۔یا شاید وہ مضبوط اینٹوں کی کوئی بہت اونچی دیوار تھی۔

"سمر کے معاملے میں کوئی پیش رفت ہوئی؟" بلآخر سلطان خالد نے گفتگو کا آغاز کیا۔

ساشا نے جو خطوط تھوڑی دیر قبل پڑھے تھے ان کا متن محض نفی میں سر ہلا کے سلطان خالد کو سمجھا دیا۔

اگلے کچھ لمحے خاموشی میں گزرے۔ وہ انہیں نہیں دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ ان کی نظریں خود پر محسوس کر سکتی تھی۔

"میں چاہتا ہوں تم سمر کی تلاش کو ترک کر دو۔" کئی مرتبہ بولا گیا جملہ دہرایا تو ان کی آواز ہموار تھی۔

اس بات پر اس نے سبز نظریں اٹھا کر انہیں دیکھا۔ "یہ حکم ہے؟"

"خواہش ہے۔"

"معذرت کے ساتھ سلطان خالد، مگر میں آپ کی اس خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتی۔" اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ کسی بھی قسم کے تاثر سے عاری۔

وہ اداسی سے مسکرائے۔ "تم اب مجھے بابا نہیں بلاتیں؟"

ساشا کے لبوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ بکھری۔ آنکھوں میں شکایتی تاثرات نمایاں ہوئے۔ "تین برس پہلے آپ نے یہ مقام خود کھویا تھا۔ آپ کے پاس دو

راستے تھے۔میرے باپ بن جاتے یا پھر رمالیہ کے عظیم بادشاہ۔اور آپ نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا تھا۔اب آپ کو شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔"

"میری جگہ کوئی بھی معقول بادشاہ ہوتا تو وہی کرتا جو میں نے کیا۔" وہ سنجیدگی سے بولے تھے۔

"مجھے اس وقت کسی معقول بادشاہ کی نہیں،اپنے باپ کی ضرورت تھی۔چاہے وہ اس دنیا کا سب سے بیوقوف مرد ہی کیوں نہ ہوتا۔" وہ رکی۔کانچ سبز آنکھوں میں تکلیف، غصہ، بے بسی ایک ساتھ اترے تھے۔"اپنی ماں کو کھویا تھا میں نے۔اپنے بھائی کے بعد میرا دوسرا سب سے قیمتی رشتہ جو مجھ سے چھن گیا۔غم سے گزر رہی تھی میں۔مجھے آپ کی ضرورت تھی۔مگر آپ نے کیا، کیا؟ آپ نے والدہ کی موت کو قتل کے بجائے قدرتی موت قرار دے کر میرے غم میں مزید اضافہ کر دیا۔یہ اعلان کر کے، کہ سلطانہ طبعی موت مری تھیں آپ نے مجھ پر لگے الزامات کو سچ مان لیا۔آپ نے مجھے میری ماں کا قاتل بنا دیا۔" وہ رکی۔ان کی آنکھوں میں

پچھتاوا دیکھنے کی خواہش کی۔ مگر وہاں ایسا کوئی تاثر اسے نہیں ملا۔ وہ نظریں اس پہ مرکوز کیے اسے محض توجہ سے سن رہے تھے۔

"چاہے ساری دنیا آکر مجھے کہتی کہ ساشا بنتِ خالد تم اپنی ماں کی قاتلہ ہو تو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ مگر جب میرے اپنے باپ نے میرا اعتبار نہیں کیا تو مجھے فرق پڑا۔ بہت فرق پڑا۔"

"ان دنوں تمہاری ذہنی حالت درست نہیں تھی۔ تمہاری یادیں تمہیں دھوکا دے رہی تھیں۔ امین کی گواہی کے بعد اس بات میں کوئی شبہ نہیں بچتا تھا کہ تم نے (انگشت شہادت اٹھا کے اس کی طرف اشارہ کیا) ساشا تم نے اپنے ہوش و حواس کھو کر، اپنی ماں سمیت ان پندرہ سپاہیوں کا قتل کیا تھا۔"

"چاہے ہزار لوگ آپ سے آکر یہ کیوں نہ کہہ دیتے کہ انہوں نے مجھے ایسا کرتے دیکھا ہے۔ آپ کو میرا اعتبار کرنا چاہیے تھا۔ کیونکہ میں آپ کی بیٹی تھی۔ یہ سچ ہے کہ مجھے واقعی کچھ بھی یاد نہیں ہے۔ لیکن انسان خود کو تو جانتا ہے نا.... اور میں اپنے آپ کو بہت اچھے سے جانتی ہوں۔ میں بے ہوشی کی حالت میں بھی ایسا

کچھ نہیں کر سکتی۔"اس کی آواز اونچی ہونے لگی تھی۔

"جہاں تک والدہ کی بات ہے تو میں نے اپنی آنکھوں سے ان کا قتل ہوتے دیکھا ہے۔ان کا قتل الادین نے کیا تھا۔میں نے اسے یہ کرتے دیکھا تھا۔میں نے آپ کو بھی بتایا تھا۔مگر آپ نے مجھ پر بھروسہ نہیں کیا۔"وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے ساتھ تلخ ہو رہی تھی۔"کسی نے میرا یقین نہیں کیا۔نہ میرے باپ نے۔نہ استاد امین نے۔نہ ممانی نے۔میرے خونی رشتوں نے میری طرف کی کہانی سنے بغیر مجھے گناہگار تصور کر لیا۔"وہ تلخی سے سر جھٹک کے خاموش ہو گئی۔

سلطان خالد چند لمحے اسے افسوس سے دیکھتے رہے۔

"کیا ہمارے درمیان عائد یہ دیوار گر نہیں سکتی۔"وہ کافی دیر بعد بولے تھے اور بہت بے بسی سے بولے تھے۔

"اس دیوار کی بنیاد آپ نے رکھی تھی۔"اس کے لہجے کی تلخی برقرار رہی۔

"اور تم اینٹیں لگا کر اسے مزید اونچا کر رہی ہو۔"

"میں تو پھر ایسی ہی ہوں سلطان خالد۔"اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔"

یہ لحاظ کیے بغیر کہ سامنے میرا باپ ہے یا کوئی اور انسان، اچھائی کا بدلہ اچھائی سے چکاتی ہوں اور برائی کا برائی سے۔"

"آخر بھول کیوں نہیں جاتیں تم وہ برے دن؟"

"جب مجھے آپ کی ضرورت تھی تب آپ میرے لیے دستیاب نہیں تھے۔ اب آپ مجھ سے یہ امید نہیں رکھ سکتے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں۔ نہ ہی کوئی شکایت کر سکتے ہیں۔ آپ کو کرنی ہی نہیں چاہیے۔"

"اس ذہنیت کے ساتھ بنو گی تم رمالیہ کی سلطانہ؟" وہ بہت ضبط سے بول رہے تھے۔ "ایک اچھے حاکم میں یہ خصوصیت ہونی چاہیے کہ وہ اپنی رعایا کی غلطیوں کو معاف کر سکے۔ اور تم اپنے باپ تک کو معاف نہیں کر رہی۔ پرائے لوگوں کو کیا کرو گی۔"

"جانتے ہیں میں نے آپ کو آج تک معاف کیوں نہیں کیا؟ کیونکہ آپ آج بھی میرا اعتبار نہیں کرتے۔" اس نے سوال کر کے انہیں بولنے کا موقع دیئے بغیر خود ہی جواب بھی دیا۔ "آپ کو آج بھی یہی لگتا ہے کہ میں نے اپنی ماں سمیت، ان

پندرہ سپاہیوں کو جان سے مارا ہے۔"ان کے چہرے کو دیکھتے ہوئے وہ اداسی سے مسکرائی۔"آپ نے آج بھی مجھے یہاں اس لیے بلایا ہے تاکہ مجھے سمر کے معاملے سے پیچھے ہٹ جانے کے لیے قائل کر سکیں۔آج بھی جب میں کہتی ہوں کہ وہ زندہ ہے تو آپ سمجھتے ہیں یہ میرا وہم ہے۔کیونکہ اب آپ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔آپ نے خود تو کئی برس پہلے اس پر ہار مان لی تھی۔اب آپ چاہتے ہیں کہ میں بھی اسے بھول جاؤں۔لیکن میرے لیے اسے بھولنا آسان نہیں ہے۔میں بھلانا چاہتی ہی نہیں ہوں۔کوئی غیر ہوتا تو بھول جاتی۔لیکن وہ کوئی غیر نہیں ہے۔میرا جڑواں بھائی ہے۔"اس کی آنکھوں میں نمی ابھری مگر وہ اسی کرب سے کہتی گئی۔"وہ میرے وجود کا حصہ ہے۔روح کا تعلق ہے ہمارا۔اتنی آسانی سے نہیں ٹوٹے گا۔"

یہ گفتگو ان کے درمیان پہلی مرتبہ نہیں ہو رہی تھی۔نہ ہی یہ آخری مرتبہ تھا۔پہلے بھی کافی بار اس موضوع پر بات ہو چکی تھی۔اور آئندہ بھی ضرور ہو گی۔مگر وہ سلطان خالد کو وہ کبھی نہیں دے سکتی تھی جو وہ اس سے چاہتے تھے۔وہ یہ تلاش

کسی قیمت پر ترک نہیں کر سکتی تھی۔

"میں نے اسے تلاش کرنا اس لیے چھوڑ دیا کیونکہ یہ جان لیا تھا کہ میرا بیٹا اب مجھے واپس نہیں ملے گا۔ سولہ برس بیت چکے ہیں اس حادثے کو۔ ممکن ہے وہ مر چکا ہو۔" یہ امکان بتلاتے ہوئے ان کی آواز کانپی تھی۔

"جس دن وہ مرے گا، اس دن یہاں (انگشت شہادت سے سینے پہ دستک دی) میرے اندر بھی کچھ مر جائے گا۔"

انہوں نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا۔ "تمہاری یہ تلاش لاحاصل ہے بچے۔ اس سراب کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو۔ آخر کب تک ڈھونڈو گی اسے؟"

"جب تک وہ مجھے مل نہیں جاتا۔" اس نے گیلی آنکھیں رگڑیں۔ اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ پھر سلطان خالد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ہموار آواز میں کہنا شروع کیا۔ "آپ اپنے بیٹے پر ہار مان سکتے ہیں سلطان خالد۔ میں اپنے بھائی پر ہار نہیں مانوں گی۔ میں اسے تلاش کروں گی۔ کم از کم تب تک جب تک مجھے یہ احساس ہوتا رہے گا کہ وہ زندہ ہے۔ میں نہیں جانتی وہ کہاں ہے؟ مگر وہ ہے۔" اس

نے ہے کو زور دے کر ادا کیا۔"اسی دنیا میں موجود، کہیں سانسیں لے رہا ہے۔ آپ کہتے ہیں میری تلاش لاحاصل ہے۔ مگر میرا دل کہتا ہے کہ سمرِبن خالد میری تلاش کا حاصل بنے گا۔ وہ مجھے ملے گا۔اور وہ مجھے ضرور ملے گا۔"کسی چٹان کی طرح پختہ اعتماد سے کہہ کے وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

"تمہارے اس سفر کی کوئی منزل نہیں ہے، ساشا۔ کیونکہ تمہاری تلاش کا کوئی حاصل نہیں ہے۔"ان کی آواز پہ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اسی شاہانہ انداز میں صوفے پہ براجمان تھے۔"ایک دن آئے گا جب تم اس راستے پر چلتے چلتے تھک جاؤ گی۔تب تمہیں ہار ماننی ہی پڑے گی۔اس دن تم خود مجھ سے آکر کہو گی کہ میں درست کہتا تھا۔اور تم ہمیشہ غلط تھیں۔"

"تو پھر میں بھی آپ کو یقین دلاتی ہوں سلطان خالد کہ وہ دن کبھی نہیں آئے گا۔"پُرزور انداز میں کہہ کر وہ کمرے سے نکل گئی۔

اپنے کمرے میں آئی تو پردہ ہٹا کر سیدھا بالکونی میں آ کے کھڑی ہو گئی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے کو چھونے لگی۔اس نے آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔"کہاں ہو

www.novelsclubb.com

تم سمر؟ تم تو کہتے تھے ہم دونوں، دو جسم ایک روح ہیں۔ایک دوسرے کا سایہ ہیں۔ پھر مجھے تنہا چھوڑ کر کیوں چلے گئے ؟" بے بسی سے کہتے ہوئے اس نے آنکھیں کھولیں اور سامنے کا سنہری منظر دیکھا۔دور دور تک جہاں بھی نظر جاتی تھی، طویل میدانوں میں سنہری گھاس لہراتا دکھائی دیتا تھا۔

اس سنہری گھاس کو دیکھ کر اسے ہلکے سنہری رنگ کی آنکھوں والا ایک حسین، دلکش چہرہ یاد آیا۔اسے سنہری رنگ کو دیکھ کے ہمیشہ وہی یاد آتا تھا۔ پچھلے دو برسوں میں ایسا ایک بار بھی نہیں ہوا تھا کہ خزاں کے موسم میں وہ بالکونی میں آ کے کھڑی ہوئی ہو اور اسے وہ یاد نہ آیا ہو۔ پتہ نہیں وہ کیوں یاد آتا تھا؟

"سچ کہوں تو میں واقعی تھک گئی ہوں۔"

اس کے خیالوں کو ذہن سے جھٹک کے وہ خلا میں دیکھتے ہوئے واپس سمر سے باتیں کرنے لگی۔وہ آنکھوں کے سامنے نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اس سے باتیں کر کے دل کو تسلی رہتی تھی کہ وہ آج بھی کہیں وجود رکھتا ہے۔

"آہستہ آہستہ مجھ میں صبر ختم ہوتا جا رہا ہے۔سب کہتے ہیں میں تم پہ ہار مان لوں

۔کیونکہ تم نہیں ہو۔لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تم کہیں سانسیں لے رہے ہو۔میں محسوس کر سکتی ہوں۔"اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔"اور جب تک یہ احساس ہوتا رہے گا،چاہے کتنی ہی رکاوٹیں کیوں نہ آئیں، تمہیں تلاش کرنا نہیں چھوڑوں گی میں۔"اس کا جذبہ کسی چٹان کی مانند تھا۔

وہ واپس کمرے میں آئی اور مطالعے میز کے گرد بیٹھ کر ان تمام خطوط کا جواب لکھنے لگی جنہیں تھوڑی دیر قبل وہ پڑھ رہی تھی۔اس نے مشرقِ وسطی کے تمام بڑھے شہروں میں اپنے بااعتماد لوگ چھوڑ رکھے تھے۔جن کی واحد ذمہ داری مثلج کے گمشدہ شہزادے کے بارے میں سراغ لگانا تھا۔وہ گھر گھر جا کر سات سالہ سمر کی تصویر دکھاتے تھے۔مگر سولہ سال بعد بھی کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا۔ابتدائی سات برس تک سلطان خالد نے یہ کام کیا تھا اور جب انہوں نے تھک کر ہار مان لی تو ساشا نے اس کام کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔اس وقت وہ صرف پندرہ سال کی تھی۔ سلطان خالد کو یہ غلط فہمی تھی کہ کچھ مہینوں بعد وہ خود ہی تنگ آ کر یہ سب چھوڑ دے گی مگر اب آٹھ برس بیت گئے تھے اور اس نے آج تک اپنی تلاش جاری رکھی

تھی۔

وہ آخری خط لکھ رہی تھی جب دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجائیں۔"اس نے لکھائی جاری رکھتے ہوئے بنا نظر اٹھائے اندر آنے کی اجازت دی۔

"شہزادی آپ کی دوست آئیں ہیں۔"خادمہ نے مودبانہ انداز میں کہا۔

وہ خادمہ یقیناً نئی تھی۔ورنہ محل میں سب کو معلوم تھا کہ شہزادی ساشا کی کوئی دوست نہیں ہے۔جو ایک زبردستی کی تھی وہ سمندر پار رہتی تھی۔اور اطلاع کیے بغیر کبھی نہیں آتی تھی۔

"میری کوئی دوست نہیں ہے۔"وہ اسی طرح لکھتے ہوئے بے دھیانی سے بولی۔

"لیلیٰ بنتِ شہاب بھی نہیں؟"اس آواز پہ اس کے ہاتھ میں موجود قلم تھم گیا۔

اس نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔خادمہ کے پیچھے۔اس کی ہم عمر، سبز آنکھوں اور گہرے سیاہ بالوں والی ایک لڑکی اسے مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔وہ چل کے خادمہ کے مقابل آئی۔

"میں نے آپ سے کہا تھا آپ نیچے ہی انتظار کریں۔ پھر آپ اوپر کیوں آ گئیں؟" خادمہ کا لہجہ قدرے برہم تھا۔ اس نے معذرت خواہانہ نظروں سے شہزادی کو دیکھا۔

"تم جاؤ۔" وہ جو ناراضی کی توقع کر رہی تھی شہزادی کی بات پر حیران ہوئی۔

"مگر شہزادی...."

ساشا نے سبز آنکھیں موٹی کر کے اسے دیکھا تو وہ سر کو خم دیتی باہر نکل گئی۔

لیلیٰ چل کر اس کے قریب آئی اور بازو پھیلائے۔

"اٹھو اور مجھ سے گلے ملو۔" وہ نہایت پُرجوش تھی۔

ساشا نے آنکھیں گمائیں۔ مگر پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر اس سے گلے ملی۔

"تم مجھے بتائے بغیر آ گئیں؟" لیلیٰ کو خود سے دور ہٹاتے ہوئے اس کے ابرو خفگی سے اکٹھے ہوئے۔

"پہلے میں تمہیں خط لکھتی جو چھ دن بعد تم تک پہنچتا۔ پھر تین چار دن تمہارا خط مجھ تک پہنچنے میں لگتے۔ اس لیے میں نے سوچا کیوں نہ وقت کی بچت کی جائے۔

آخر وقت سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہوتی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی رہی تھی۔

"کیسی ہو؟" کندھے سے کپڑے کا تھیلا اتارتے ہوئے اس نے اپنائیت سے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"مجھ سے بھی پوچھ لو۔"

"اتنا طویل سفر طے کر کے آئی ہو تو ظاہر ہے ٹھیک ہی ہو گی۔" اس کی رکھائی پر لیلیٰ اسے کھلے منہ سے دیکھ کے رہ گئی۔

"اتنی جلی ہوئی کیوں لگ رہی ہو؟" اس نے اسے چھیڑنا چاہا۔

ساشا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ واپس کرسی پر بیٹھ کر خط دوبارہ لکھنا شروع کر دیا۔

www.novelsclubb.com

"تم کسے خط لکھ رہی ہو؟" لیلیٰ اس کے کندھے کے پیچھے سے میز پہ جھکی۔

مگر خط کی شروع کی چند سطور پڑھ کے اسے خود ہی سمجھ آ گئی۔ ساشا نے خط مکمل کر لیا تو اسے بھی دیگر خطوں کی طرح لفافے میں ڈال کر ایک طرف رکھ دیا۔

"ساشا تم ٹھیک ہو؟" اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔وہ اس کے سامنے میز کے کنارے بیٹھ گئی۔

"تمہاری سلطان خالد سے سمر کے بارے میں دوبارہ بات ہوئی ہے؟"وہ اب سنجیدہ تھی۔

ساشا نے اثبات میں گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔

"کیا کہا انہوں نے؟"

"وہی جو وہ ہر دفع کہتے ہیں۔"

لیلیٰ نے اس کے میز پہ رکھے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"ساشا میری طرف دیکھو۔"اس نے اس کے ہاتھ پہ دباؤ ڈال کر کہا تو اس نے اپنی سبز آنکھیں اٹھا کے لیلیٰ کی سبز آنکھوں میں دیکھا۔"تمہاری تلاش لاحاصل نہیں ہے۔اور تم کسی سراب کے پیچھے نہیں بھاگ رہیں۔اگر تمہارا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے تو پھر وہ واقعی زندہ ہے۔میں نہیں جانتی کب؟ مگر وہ تمہیں ضرور ملے گا۔"

ساشا مسکرائی۔بہت اداس مسکراہٹ تھی۔اس کے سامنے بیٹھی یہ لڑکی وہ واحد

انسان تھی جو اس پر اندھا دھن اعتماد رکھتی تھی۔ جو اس پر بے تحاشا اعتبار کرتی تھی۔ جب اس کے خونی رشتوں میں سے کسی نے اس پر بھروسہ نہیں کیا تب بھی لیلیٰ وہ واحد شخص تھی جس نے اس کے کہے ہر لفظ کا یقین کیا تھا۔

"تم کیوں آئی ہو؟" ساشا کے سوال پر لیلیٰ نے اسے آنکھیں دکھائیں تو اس نے فوراً سوال کی تصحیح کی۔ "اب صرف میرا حال احوال پوچھنے کے لیے تو تم اتنا لمبا سمندری سفر طے کر کے آنے سے رہی۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔"

"تمہارے لیے ایک اچھی اور ایک بری خبر لے کر آئی ہوں۔" وہ کسی غیر مرعی نقطے پر نظریں جمائے بولی۔

لیلیٰ کے سنجیدہ انداز پہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھی۔ "پہلے بری بتاؤ۔"

اس نے گہرا سانس لے کر ساشا کی آنکھوں میں جھانکا۔ "قلبلار میں الادین نامی ایک بندے کی تشخیص ہوئی ہے۔"

"تو یہ تو اچھی خبر ہے۔" ساشا کی آنکھیں چمکیں۔

"ہاں یہ اچھی خبر ہی تھی۔"

"پھر بری کیا ہے؟"اس کے دونوں ابرو اکٹھے ہوئے۔

"اس الادین سے ملنا ناممکن ہے۔"لیلیٰ نے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا۔

"کیوں؟"

"الادین کا وجود اپنے آپ میں ایک بھید ہے۔اسے آج تک کسی نے نہیں دیکھا۔ قلبلار میں مجرموں کا ایک نامور گروہ ہے۔وہ اسی گروہ کا سب سے اہم فرد ہے۔ کسی وائل بِن آدم کے لیے کام کرتا ہے۔"

"کیا کام؟"

"قتل۔"

"کب سے؟"

"پچھلے تین برس سے۔"

"یہ وہی الادین ہے۔"وہ پھرتی سے کرسی سے اٹھی۔اور کونے میں رکھے درازوں کی طرف بڑھی۔"میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں، یہ وہی ہے۔"

www.novelsclubb.com

"ساشا قتل اور پچھلے تین برس سے اس کا وائل کے لیے کام کرنا.... یہ سب اتفاق بھی تو ہو سکتا ہے نا؟" لیلیٰ اس کے پیچھے لپکی تھی۔

"اتنی ساری مماثلتوں کو ہم اتفاق قرار نہیں دے سکتے۔" وہ دراز کھول کر بیچ میں سے اپنا آئندہ ہفتے کا جدول نکال رہی تھی۔ یکدم کسی خیال کے تحت رک گئی۔ اس نے رُخ لیلیٰ کی طرف موڑے اسے غور سے دیکھا۔ "یہ خبر تم مجھے خط میں بھی لکھ کر بتا سکتی تھیں۔ اور جتنا میں تمہیں جانتی ہوں، تم اتنا طویل سفر طے کر کے مجھے صرف یہ بات بتانے یہاں کبھی نہیں آتی۔"

"بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" لیلیٰ وسط میں بچھے صوفوں میں سے ایک کی طرف چلی گئی۔

www.novelsclubb.com

ساشا اس کے پیچھے آئی۔

"میں نہران جا رہی ہوں۔" وہ نڈھال سی کہتی صوفے پر بیٹھی۔

"کیوں؟" ساشا آنکھوں میں بے پناہ الجھن لیے اس کے نزدیک بیٹھی۔

"اپنی ماں سے ملنے۔" وہ بولی تو آواز بے حد دھیمی تھی۔

ساشا کو لگا اسے سننے میں مغالطہ ہوا ہے۔

لیلیٰ کے والد کا تعلق قائرہ سے تھا جبکہ ماں غابانیہ میں پیدا ہوئی تھیں۔ان دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ مگر لیلیٰ کی پیدائش کے دس سال بعد دونوں کے درمیان طلاق ہو گئی۔اس نے باپ کے ساتھ رہنے کا انتخاب کیا تھا۔اور اتنے سالوں میں ماں کی پلٹ کر خبر تک نہیں لی۔ وہ اسے بلاتی رہیں۔ مگر وہ نہیں گئی۔ اسے اپنی ماں سے شکایت تھی کیونکہ انہوں نے شوہر کے مالی حالات کی وجہ سے خلا لے لی۔ مشکل وقت میں انہیں تنہا چھوڑ دیا۔

وہ لیلیٰ کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتی تھیں لیکن اس نے ان کے ساتھ نہران منتقل ہونے سے صاف انکار کر دیا۔تب سے لے کر اب تک وہ اپنے بابا کے ساتھ ہی سادہ مگر پُر سکون زندگی گزار رہی تھی۔ لیلیٰ کے بابا.... شہاب چچا،ایک متوازن آمدنی کمانے والے معمولی سے کسان تھے۔ لیکن وہ انتہائی شفیق انسان معلوم ہوتے تھے۔

"تم نے تو کہا تھا تم اپنی ماں سے کبھی نہیں ملو گی۔"

"وہ بیمار ہیں ساشا۔"اس کی سبز آنکھوں میں ہلکی نمی ابھری۔"میری ماں بیمار ہے۔"

ساشا نے اسے ہمیشہ صرف اپنے بابا کے لیے پریشان ہوتے دیکھا تھا۔اور آج زندگی میں پہلی مرتبہ وہ اپنی ماں کے لیے ایسے فکر مند ہوئی تھی۔

"کیا ہوا انہیں۔"اس نے پوچھا۔

"وہی منحوس بیماری۔"اس نے تلخی سے ہاتھ جھلایا۔

ساشا نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے افسوس سے سانس لی۔

قریباً چھ برس پہلے،نہران میں ایک بیماری پھیلنا شروع ہوئی تھی۔اور عجیب بات یہ تھی کہ وہ کوئی چھوتی بیماری نہیں تھی۔نہ ہی اس کے جراثیم آب وہوا میں پائے جاتے تھے۔وہ جیسے اس سرزمین پہ پیدا ہوئے لوگوں کے لیے شراپ تھی۔کسی کی دی گئی بددعا جیسی۔

بخار،ناک سے خون بہنا، مستقل سر درد،وغیرہ جیسی دیگر عام علامات والی یہ بیماری صرف نہران کے پیدائشیوں کو ہوتی تھی۔وہ دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے

جائیں یہ بیماری وہاں کے پیدائشی کی جان نہیں چھوڑتی تھی۔

پہلے سال بہت جانی نقصان ہوا تھا۔اس کا علاج طبیبوں کی سمجھ سے باہر تھا۔ مگر پھر آہستہ آہستہ، طبّی جانچ پرکھ اور مختلف ادویات کے استعمال کے ذریعے بیماری کا علاج ڈھونڈ لیا گیا۔ایک خاص قسم کے جنگلی پتے۔

متوازن مقدار میں باقاعدگی سے لیے جانے والے یہ پتے بیماری کے ہونے کے امکان کو کم کرتے تھے۔

مگر ایک مرتبہ انسان اس بیماری کا شکار ہو جائے تو پھر اس کے پاس دو راستے ہوتے تھے۔یا تو تین مہینے کے اندر اندر موت۔یا پھر ایک دوسری جڑی بوٹی کا استعمال جو موت سے بچنے کے لیے تو کارآمد تھی لیکن اس کے منفی اثرات انسان کی کوئی نہ کوئی حس چھین لیتے تھے۔جیسے کہ یادداشت، بینائی، سماعت، ذائقہ، قوت گفتگو یا پھر محسوس کرنے کی صلاحیت۔اور یہ ہر مریض کی قسمت پہ منحصر تھا کہ اسے زندگی کے بدلے کیا گنوانا پڑے گا۔

"انہوں نے خط میں میری منت کی ہے کہ میں یہ آخری تین مہینے ان کے ساتھ

گزاروں۔ میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کروں گی کہ وہ جڑی بوٹی کا استعمال کر لیں۔ مگر مجھے معلوم ہے وہ میری نہیں سنیں گی۔ انہوں نے تیرہ سال پہلے بھی میری نہیں سنی تھی۔" لیلیٰ افسوس سے اسے بتا رہی تھی۔

ساشا نے دھیان سے اس کی بات سنی۔

"تم اکیلی جا رہی ہو؟"

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" ساشا کی آنکھوں میں ذرا سی پریشانی اتری۔ "دو دن بعد سفارتی وفد نہران کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔ تم ان کے ساتھ چلی جانا۔ محفوظ رہو گی۔"

www.novelsclubb.com

"اچھا۔" اس نے سمجھ کے سر ہلا دیا۔

"اور وہاں کوئی الٹے سیدھے جھمیلوں میں مت پڑ جانا۔ جس کام کے لیے جا رہی ہو بس وہی کرنا۔" ساشا نے سختی سے اسے آنکھیں دکھائیں۔

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیئے۔

"تم بھی اب اس الادین سے ملنے قلبلار مت پہنچ جانا۔اس سے میں خود ملوں گی۔"لیلیٰ نے گردن اونچی کر کے جیسے اعلان کیا۔

"مگر...."

"اگر مگر کچھ نہیں۔اسے میں نے ڈھونڈا ہے۔اس لیے اسے ملوں گی بھی میں خود۔"اس کا اٹل انداز ایسا تھا کہ ساشا نے مزید اصرار نہیں کیا۔

"تم واپس کب آؤ گی؟"

"بڑی عید پر آؤں گی۔ مگر اس کے بعد دوبارہ چلی جاؤں گی۔میں زیادہ سے زیادہ وقت اپنی ماں کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔"

کتنے افسوس کی بات تھی کہ جب چیزیں ہماری مٹھی میں ہوتی ہیں تب ہم غلط پہ غلط فیصلے کرتے رہتے ہیں۔اور جب وقت کم رہ جاتا ہے تو اپنی کی گئی غلطیوں کو درست کرنے کی کوشش کرنے میں لگ جاتے ہیں۔کچھ روز پہلے تک وہ اپنی ماں کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی تھی اور آج وہ ان کے لیے سمندر پار کر آئی تھی۔

شاید شہزادے حاتم نے ٹھیک کہا تھا،ریت کی طرح ہاتھ سے پھسلتا وقت انسان

سے سب کچھ کروا تا ہے۔

"کسے یاد کر کے مسکرا رہی ہو؟" لیلیٰ نے اسے آنکھیں چھوٹی کیے عجیب تاثرات کے ساتھ دیکھا۔

وہ مسکرا رہی تھی؟

شہزادہ حاتم۔ کیا محض یہ نام کو سوچ کر اس کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی تھی؟

پچھلے دو سالوں میں ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ نہران کا ذکر ہوا ہو اور اس کی سوچیں بے اختیار نہران کے شہزادے تک نہ گئی ہوں۔ لیکن وہ اسے سوچ کر مسکراتی بھی تھی؟ کیا وہ اتنی سحر کن شخصیت کا حامل تھا کہ وہ جو سارے خطے میں کبھی نہ مسکرانے کے لیے مشہور تھی، محض اس کا خیال آنے پہ بے اختیار مسکرا دیتی تھی؟

ساشا نے سر جھٹکا۔

"نہران کے شہزادے کو۔" لہجے کو عام رکھے جواب دیا۔

"تم ملی ہو اس سے؟" لیلیٰ کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"کاش مل لیتی۔" وہ منہ میں بڑبڑائی۔

"تھوڑا اونچا بولو۔" لیلیٰ کو سنائی نہیں دیا۔

"نہیں۔ بس دیکھا ہے۔" ساشا نے بے ربط لہجہ رکھے شانے اچکائے۔

"کیسا ہے وہ؟" وہ یکدم پُرجوشی سے پوچھنے لگی۔

ساشا کی آنکھوں میں ناگواری اتری۔ "بہت نخریلا۔"

وہ صرف تین دن کے لیے محل میں رہ کر گیا تھا لیکن اگلے چھ مہینے تک اسی کی باتیں ہوتی رہی تھیں۔

"نہران کے شہزادے نے آج رات کا کھانا نہیں کھایا کیونکہ اسے وہ ضرورت سے زیادہ پکا ہوا لگا۔"

"نہران کے شہزادے نے روایتی مٹی کے برتنوں میں کھانا کھانے سے صاف انکار کر دیا۔"

"نہران کے شہزادے کی چائے میں چینی کا ایک ذرا زیادہ ہو گیا، اس نے چائے کو دوبارہ دیکھا تک نہیں۔"

"آج سلطان خالد کی پسندیدہ مچھی بنی تھی، مگر شہزادے حاتم نے یہ کہہ کر

کھانے سے انکار کر دیا کہ اسے بناکانٹوں کے مچھی کھانے میں مزا نہیں آتا۔"

"آج افطاری پہ شہزادے حاتم نے عجیب تماشا لگایا۔ سیب اسے ضرورت سے زیادہ سخت لگا۔ کیلا اسے ضرورت سے زیادہ نرم لگا۔ مالٹا اسے ضرورت سے زیادہ کھٹا لگا۔ کھجوریں اسے ضرورت سے زیادہ میٹھی لگیں۔ آڑو اسے ضرورت سے زیادہ پکا ہوا لگا۔ اور خوبانی اسے ضرورت سے زیادہ کچی لگی۔ دستر خوان پہ موجود کوئی ایسا پھل نہیں تھا جس میں اس نے کوئی نقص نہ نکالا ہو۔ آخر میں صرف سادہ پانی پی کے اٹھ گیا۔"

"سبزیوں کو دیکھ کر بھی اس کے منہ پہ بارہ بج جاتے ہیں۔"

"گوشت بھی ناک چڑھا کے کھاتا ہے۔"

"وہ صرف ایک مخصوص درجہ حرارت پر گرم ہوا پانی پیتا ہے۔ آج میں پانچ مرتبہ پانی گرم کر کے لے کے گئی مگر اسے پھر بھی پسند نہیں آیا۔"

"کھانے کے وقت اسے دستر خوان پہ ایک خاص قسم کی خوشبودار موم بتی چاہیے ہوتی ہے۔"

www.novelsclubb.com

باورچی خانے اور راہداریوں سے گزرتے وقت شاشا کو اس نخریلے شہزادے کے کارنامے سن کے حیرانی ہوتی تھی۔ پتہ نہیں وہ کاملیت پسند تھا یا پھر سمجھتا تھا کہ شاہی خاندان میں پیدا ہو کے کوئی بہت بڑا تیر مار لیا ہے۔

اس کے جانے کے بعد بھی اس نے شاہی ملازموں کو اکثر اس پہ تبصرے کرتے سنا تھا۔ نجانے کیوں مگر ان دنوں وہ بری طرح اس کے حواسوں پہ سوار تھا۔ رہ رہ کے اسی کا خیال آتا تھا۔ اوپر سے سارے خادم اس کی باتیں کر کے اسے اپنے خیالوں سے نکالنے کی تمام کوششوں پہ پانی پھیر دیتے تھے۔ شروع شروع میں اسے غصہ آتا تھا۔ خود پر۔ خادموں پر۔ اس نخریلے شہزادے پر۔ مگر پھر وہ اس کے ذکر کی عادی ہو گئی۔

www.novelsclubb.com

"میں نے شکل کا پوچھا تھا۔" لیلیٰ نے ناک چڑھایا۔

وہ ذرا توقف کر کے بولی۔ "خوبصورت ہے۔ مگر...."

"مگر؟"

"مگر اس کی آواز زیادہ خوبصورت ہے۔" وہ ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"آواز بھی سنی ہے تم نے؟"لیلیٰ کی آنکھیں خوشی سے چمکیں۔

اسے محلوں اور محلوں کے باسیوں کی باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔

"سب سے پہلے آواز ہی سنی تھی۔"ساشا کی آنکھوں میں نرم سا تاثر ابھرا۔

دو برس قبل اس نے پہلی اور آخری مرتبہ نہران کے شہزادے کی آواز سنی تھی ۔لیکن تاثیر بھری وہ آواز اس کے دل میں کُھب گئی تھی۔

"کیسی تھی اس کی آواز؟"

وہ مسکراتی آنکھوں سے یاد کر کے بتانے لگی۔

(وہ محل کے پیچھے موجود گھاس کے طویل میدانوں کے بیچ و بیچ کھڑا لکڑی کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔

ساشا ایک پلنگ پر چت لیٹی چھت کو تک رہی تھی۔ہلکی ہوا کے باعث ہلتے سفید پردوں کے بیچ سے چھن کے آتی تپتے سورج کی روشنی لکڑی کے چمکتے فرش کو مزید چمکدار بنا رہی تھی۔ مخملیں قالین پہ بیٹھی خادمہ گلاب کے پھول لڑیوں میں پرونے

میں مصروف تھی۔وہ لڑیاں عید کی سجاوٹ کے لیے تیار کی جارہی تھیں۔فضا میں گلاب کی خوشبودار پتیوں کا عطر بکھرا تھا۔

ساشا پچھلے ایک برس سے اکثر وقت اسی لکڑی کے مکان میں بے مقصد لیٹے لیٹے گزار دیا کرتی تھی۔اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سونے کی ناکام کوشش کی۔اسے آج کل نیند نہیں آتی تھی۔

اس کی آنکھیں اداس تھیں۔دل غمگیں تھا۔روح رنجیدہ تھی۔وہ اب تک اپنی ماں کی موت کے غم سے نہیں نکل سکی تھی۔بھائی کی گمشدگی نے اگر اس کے اندر طوفان مچایا تھا تو ماں کی موت نے اسے ساکن کر دیا تھا۔وہ کم بولنے لگی تھی۔کم سننے لگی تھی۔کم دیکھنے لگی تھی۔اس کا کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔نمازوں میں خشوع و خضوع ختم ہو گیا تھا۔آئے روز اس کے اور سلطان خالد کے درمیان تلخ کلامی ہوتی تھی۔اس نے لوگوں سے کھنچا کھنچا رہنا شروع کر دیا تھا۔جس زندگی کو وہ نعمت سمجھتی تھی وہ اب اسے زحمت لگنے لگی تھی۔

"اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے مدد طلب کرو۔بے شک اللہ صبر

کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"(سورۃ البقرہ: آیت ایک سو ترپن)

باہر سے آتی کسی کی گہری، سریلی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔)

"سمندر جیسی گہری۔

(ساشا نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں۔

وہ آواز سحر تھی یا اس کلام نے اسے سحر زدہ کر دیا تھا، وہ فیصلہ نہیں کر سکی۔

اسے خود قرآن پڑھے کئی مہینے بیت گئے تھے۔ کسی اور کے منہ سے کلام اللہ سن کے اس کے اندر تک راحت اتری تھی۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہت خوبصورت تلاوت کرتا تھا۔ اس کی خوش آہنگ آواز میں عجیب قسم کی مٹھاس تھی۔)

چاشنی جیسی میٹھی۔

(اس کا خالق اسے صبر کے ذریعے مدد طلب کرنے کا کہہ رہا تھا۔ لیکن پچھلے کئی برسوں سے وہ صبر ہی تو کرتی آئی تھی۔ اتنا صبر کیا تھا کہ صبر کی جس ڈور کو تھام کے وہ اب تک چل رہی تھی وہ اب کمزور پڑ کے ٹوٹنے کی انتہا پہ تھی۔ اسے اتنے برسوں بعد بھی اس کے صبر کا ثمر نہیں ملا تھا۔ اسے اس کا سمر نہیں ملا تھا۔

نہ وہ ملتا تھا۔ نہ اس کی جدائی کا غم کم ہوتا تھا۔ پہلے وہ لوگوں کے تبصروں کو نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ مگر اب اسے سمر کی ممکنہ موت کی باتوں سے خوف آنے لگا تھا۔ اوپر سے والدہ کی موت کا غم۔ ایک زخم ابھی بھرا نہیں تھا کہ دوسرا اسے مل گیا تھا۔ بھائی ابھی واپس نہیں ملا تھا کہ ماں کا ساتھ بھی چھوٹ گیا تھا۔ سمر کے بعد اس کا سب سے قیمتی رشتہ جو اپنی جان گنوا بیٹھا تھا۔ اس کا نقصان بہت بڑا تھا۔

"اور یقیناً ہم تمہیں کسی خوف، بھوک، مال، جان اور ثمرات کے نقصان سے آزمائیں گے، لیکن صبر کرنے والوں کو خوش خبری سنا دو۔" (سورۃ البقرہ: آیت ایک سو پچپن)

ساشا پہ بے ساختہ ہیبت سی طاری ہوئی تھی۔ لمحے بھر کے لیے اس کا سارا وجود

کانپا تھا۔ یہ آیات اس کی سوچوں سے اتنا میل کیوں کھا رہی تھیں؟

اس کا حلق سوکھنے لگا۔)

صحراؤں کی طرح خشک۔

("جن پر جب کوئی مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: بے شک ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔" (سورۃ البقرہ: آیت ایک سو چھپن)

کیا اس نے اپنی ماں کے مرنے پہ ایسا کہا تھا؟

نہیں۔

www.novelsclubb.com

اس نے تو صرف آنسوں بہائے تھے۔ شکوہ کیا تھا۔ دنیا جہان سے ناراضی مول لے کر بیٹھ گئی تھی۔

اس کی آنکھوں میں نمی ابھری۔ اس نے کرب سے آنکھیں بند کیں۔ موتی جیسا ایک آنسوں اس کی آنکھ سے نکل کر کنپٹی سے بہتا ہوا بالوں میں پہنچ کر جذب ہو

گیا۔)

اوس کی طرح نم۔

(فضا میں ابھی تک اس تلاوت خوان کی سحر کن آواز بازگشت کر ہی تھا۔

"اللہ کسی جان کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔"(سورۃ البقرہ: آیت دو سو چھیاسی)

اسے لگا تھا وہ ترتیب سے سورۃ البقرہ کی تلاوت کر رہا ہے۔ مگر وہ قرآن کی مختلف آیات کو سُر میں پڑھ رہا تھا۔)

www.novelsclubb.com

امید دلاتی بہار جتنی شوخ۔

(وہ فوراً اٹھ کر بیٹھی۔

"اگر اللہ جانتا ہے تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی، تو وہ تمہیں اس سے بہتر دے گا جو تم سے لے لیا گیا ہے۔ اور تمہیں بخش دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا، مہربان ہے۔" (سورۃ الانفال: آیت ستر)

اس نے پیر زمین پہ اتارے۔ وہ اس فصیح آواز کے فسوں میں ایسی گم تھی کہ جوتے پہننے کا بھی ہوش نہ رہا۔)

سونا بکھیرتی خزاں جتنی سجیل۔

(وہ پلنگ سے اٹھی اور چمکتے لکڑی کے ٹھنڈے فرش پہ آہستہ قدموں چلنے لگی۔

"اور اسے وہاں سے رزق دے گا جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہو گا۔ اور جو کوئی اللہ پر توکل کرتا ہے تو اس کے لیے وہ کافی ہے۔ بے شک اللہ اپنا کام پورا کر کے ہی رہتا ہے۔ اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔" (سورۃ الطلاق: آیت تین)

گلاب کے پھول کی کچھ پتیاں اس کے پاؤں تلے آئیں مگر وہ آگے بڑھتی رہی۔)

برسات کے موسم میں برسنے والی پہلی برکھا جیسی۔

("قسم ہے صبح کی روشنی کی۔اور رات کی جب وہ چھا جائے۔تمہارے رب نے تمہیں نہیں چھوڑا،اور نہ ہی وہ تم سے ناراض ہے۔اور بے شک آخرت تمہارے لیے دنیا سے بہتر ہے۔اور عنقریب تمہارا رب تمہیں اتنا کچھ عطا کرے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔" وہ اب سورۃ الضحیٰ کی اگلی آیات کی تلاوت کرنے لگا تھا۔

مگر ساشا کی سوچیں پہلی پانچ آیات پہ ہی اٹک گئی تھیں۔جنہیں سن کے اس کی روح کو قرار ملا تھا۔اس کے دل کو تسکین پہنچی تھی۔اس کے سینے سے جیسے بہت سارا بھوج اتر گیا تھا۔اسے لگتا تھا اللہ کسی وجہ سے اس سے ناراض ہے۔اسے سزا دے رہا ہے۔مگر اللہ تو اسے آزما رہا تھا۔اور وہ اس کے دل کے حال سے بخوبی واقف تھا۔اسی لیے تو کسی دوسرے کی زبان کے ذریعے اس کے روتے دل کو

دلاسا دے رہا تھا۔

ساشا نے کھڑکی کے پاس پہنچ کر سفید پردہ پٹایا۔ ہوا کے ہلکے جھونکے اس کے شفاف چہرے سے ٹکرائے۔)

اس برکھا کے بعد چلنے والی ٹھنڈی ہواؤں جیسی۔

(کھڑکی سے چند گز دور، دائیں طرف، سنہری گھاس کے میدان کے بیچ و بیچ ایک درخت تھا جس کی سنہری شاخیں ہوا کے باعث جھول رہی تھیں۔ ایک نوجوان لڑکا اس درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے آس پاس لاتعداد سنہری پتے بکھرے تھے۔ گود میں ایک چھوٹے تختے پر چند کاغذ رکھے تھے اور بغل میں سیاہی کی چھوٹی سی بوتل۔ وہ اس میں قلم ڈبو ڈبو کے کاغذ پہ تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا۔

وہ بے داغ رنگت اور خوبصورت نقوش کا حامل تھا۔ اس کی نظریں گود میں

رکھے کاغذوں پہ جھکی تھیں۔اور ہلکے بھورے بال بے ترتیبی سے ماتھے پہ بکھرے تھے۔اس بات سے بے خبر کے کوئی اسے دیکھ رہا ہے،وہ بیک وقت لکھنے میں بھی مگن رہا۔اور قرآن کی تلاوت بھی کرتا رہا۔

"کیا ہم نے تمہارے لیے تمہارے سینے کو کھول نہیں دیا؟اور ہم نے اتار دیا تم سے تمہارا بوجھ۔جس نے جھکا دی تھی تمہاری کمر۔"وہ اب سورۃ الشّرح کی آیات پڑھ رہا تھا۔

قرآن مجید آخری نبی،حضرت محمد ﷺ پہ نازل ہوا تھا۔مگر اس وقت ساشا کو لگ رہا تھا اللہ نے وہ کتاب خاص اس کے لیے لکھی ہے۔جس کے ذریعے وہ اس کی رنجیدہ روح کو تسکین پہنچا رہا ہے۔

www.novelsclubb.com

آسمان پہ چمکتے سورج کے آگے سے بادل ہٹے تو تیز کرنیں سیدھی اس کی آنکھوں میں گریں۔اس کے سامنے نظر آتا منظر نامہ دھندلا گیا۔)

سردیوں کے سورج کی تپتی دھوپ جیسی گرم۔

(اس نے آنکھیں چندھا کے سامنے دیکھا۔دھندلا منظر واضح ہوا۔

وہ اب جھکے چہرے سے اس کاغذ کو ٹکڑوں میں پھاڑ رہا تھا جس پہ وہ تھوڑی دیر پہلے تک لکھ رہا تھا۔

قرآن کی تلاوت اس نے ابھی تک اسی سُر میں جاری رکھی ہوئی تھی۔

وہی مدھر،سیدھی دل پہ جا کر لگنے والی آواز۔

"اور ہم نے بلند کیا،تمہاری خاطر تمہارا ذکر۔سو بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔سو جب تم فارغ ہوا کرو تو محنت کیا کرو۔اور اپنے رب کی طرف راغب ہو جاؤ۔"

www.novelsclubb.com

وہ تلاوت ختم کر چکا تو اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

یکدم ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور کاغذ کے سارے ٹکڑوں کو چاروں طرف اُڑا لے گیا۔ایک ٹکڑا کھڑکی کی طرف بھی آیا۔ساشا نے ہاتھ آگے بڑھا کے اسے مٹھی میں دبا لیا۔وہ اس طرف متوجہ ہوا مگر اس سے پہلے وہ کچھ دیکھ پاتا،اس نے پردہ

آگے گرایااور سانس روکے دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑی ہو گئی۔

ہوا کا جھونکا اتنا تیز تھا کہ گھر کے اندر موجود پھولوں کی پتیاں بھی اڑتی ہوئی اس کے پاؤں سے آ کے ٹکرائیں۔)

اور گلاب کے پھول کی نازک پنکھڑیوں جیسی نرم۔"

(ساشا نے مٹھی میں مقید کاغذ کھول کے دیکھا۔اس پہ ایک سطر درج تھی۔

"میں سمجھتا تھا کوئی بھی چیز مجھے ولی کے ساتھ دھوکا کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔

لیکن ریت کی طرح ہاتھ سے پھسلتا وقت،انسان سے سب کچھ کروالیتا ہے۔"

سطر کا پہلا حصہ اس کے سر کے اوپر سے گزر گیا تھا۔لیکن دوسرا اس کے ذہن میں نقش ہو گیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پردہ ہٹا کر دوبارہ باہر جھانکا تو وہ اپنا سارا سامان سمیٹ چکا تھا۔

اس مرتبہ ساشا کو اس کا مکمل چہرہ نظر آیا تھا۔اور اس کے چہرے میں سب سے زیادہ نمایاں بھلا کیا تھا؟

اس کی آنکھیں۔

وہ ہلکے سنہری رنگ کی تھیں۔ایسی سنہری کہ قدرت کے حسین مناظر کی عکاسی کرتی تھیں۔

یوں، جیسے آسمان پہ چمکتا سنہری سورج ہوں۔ جیسے زیرِ خزاں رُخارا کے سنہری میدان ہوں۔ جیسے مشلج میں موجود گندم کے سنہری کھیت ہوں۔ جیسے رمالیہ کی مشہور پہچان، سنہری ریگستان ہوں۔ جیسے، جس درخت کے تنے سے ٹیک لگائے وہ بیٹھا تھا،اس کے سنہری پتے ہوں۔ جیسے پھولوں کے موسم میں رُخارا کے میدانوں میں پائے جانے والے، دھوپ میں تپتے، شہد کے چمکدار چھلے ہوں۔ جیسے آگ میں پگھلتا ہوا سونا ہوں۔

ایک ہی شخص کی آنکھوں میں اسے اپنے پورے ملک کا عکس دکھائی دیا تھا۔

ایسا تو نہیں تھا کہ آج سے پہلے اس نے سنہری آنکھوں والا کوئی چہرہ نہیں دیکھا

تھا۔ پھر صرف اسی شخص کی سنہری آنکھوں میں سمٹی ہوئی سنہری خوبصورتی اسے کیوں نظر آئی تھی؟

وہ تھیلا کندھے پہ پہن کے وہاں سے چلا گیا تو ساشا نے پردہ واپس گرا دیا۔

"سنو؟" اس نے خادمہ کو مخاطب کیا۔

"جی شہزادی۔" اس نے مودبانہ انداز میں گردن اٹھائی۔

"کون تھا یہ؟" وہ اس کے قریب آئی اور سر سے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہران کا شہزادہ۔ حاتم بِن خیام۔"

"تو یہ ہے وہ جس نے محل کے خادموں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔" اس نے دل میں سوچا۔

www.novelsclubb.com

ایک ہفتہ قبل سلطان خالد نے اسے نہران سے آنے والے سفارتی وفد کی متوقع آمد سے آگاہ کیا تھا۔ دو دن پہلے انہوں نے شہزادے حاتم کی اس سے ملاقات کی خواہش کا بھی ذکر کیا لیکن اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی سے بھی ملنا نہیں چاہتی۔

نجانے کیا بہانا بنا کے انکار کیا ہو گا اس کے باپ نے؟

"آپ کو کچھ چاہیے شہزادی؟"

وہ کافی دیر ملازمہ کے سر پہ کھڑی رہی تو اس نے پوچھا۔

"محل جا کر مجھے قرآن اور جائے نماز لا دو۔" تحکمانہ انداز میں بولی۔

خادمہ نے اسے ایسے دیکھا جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔

عرصہ ہوا تھا ان کی شہزادی نے عبادتیں کرنا چھوڑ دی تھیں۔

ساشا نے اسے آنکھیں دکھائیں تو وہ فوراً اٹھ کے دروازے سے باہر نکل گئی۔

اسے اب دوبارہ امید اور صبر کی ڈور کو تھامنا تھا۔ مگر اس سے پہلے اسے اپنے رب کی طرف راغب ہونا تھا۔)

www.novelsclubb.com

ساشا نے چہرہ لیلیٰ کی طرف پھیرا۔ وہ بنا پلک جھپکے اسے ایسے دیکھ رہی تھی، جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔

"کیا؟" وہ متذبذب ہوئی۔

"تم نے تو پورا مضمون لکھ ڈالا ہے اس پیارے کی آواز پر۔" متحیر نگاہیں اس پہ جمائے وہ واقعی بے یقینی کے عالم میں تھی۔ پھر اس کے لبوں پہ ایک شرارت بھری مسکراہٹ بکھری۔

وہ ساشا کے قریب ہو کر بیٹھی۔

"کیا بات ہے شہزادی صاحبہ، کہیں دل تو نہیں پھسل گیا اس نخریلے شہزادے پر؟" اس نے اسی شرارتی مسکراہٹ کے ساتھ ساشا کے کندھے پہ ہلکا سا ہاتھ جھڑا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے بیزاری سے آنکھیں گمائیں۔ "ان دنوں میں نے قرآن پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ نمازوں میں میرا کوئی دھیان نہیں ہوتا تھا۔ آئے دن اپنے باپ سے تلخ کلامی ہوتی تھی۔ سکون نام کی کوئی چیز نہیں تھی میری زندگی میں۔ اس کی تلاوت سن کر میری روح تک سکون اترا تھا۔"

وہ ابھی تک اسے اسی منحوس مسکراہٹ کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

"وہ بہت خوبصورت تلاوت کرتا ہے۔" وہ اسے انہی عجیب نظروں سے دیکھتی

رہی تو اس نے زور دے کر وضاحت کی۔

"مجھے یقین ہے۔" لیلیٰ نے پلکیں جھپکیں۔ اور وہی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے کچھ لمحے مزید اسے گھورتی رہی۔ پھر دونوں پاؤں اوپر کیے آرام دہ سی بیٹھ گئی۔

"ویسے سوچو کتنا اچھا ہوا اگر میری اتفاقیہ اس سے ملاقات ہو جائے۔" ایک نہایت ہی فضول امکان کو سوچ کے وہ خوش ہوئی۔ اسے عالیشان انسان اور چمکتی چیزیں متاثر کرتی تھیں۔

ساشا اور اس کی دوستی کی ایک وجہ ساشا کا شہزادی ہونا بھی تھا۔ اگر وہ شہزادی نہ ہوتی تو شاید لیلیٰ خانم اسے کسی کھاتے میں ہی نہ لیتیں۔

"اتنے حسین اتفاق حقیقی زندگی میں نہیں ہوتے۔" ساشا نے طنز سے سر جھٹکا۔ اس کے تاثرات بگڑے۔

"قدرت کے کھیل نرالے ہوتے ہیں۔ کچھ بھی ممکن ہے۔" گردن کڑائے اعتماد سے بولی۔

"تمہاری اور اس کی ملاقات اس صورت ممکن ہوتی اگر وہ وہاں ہوتا۔" اس نے

دھیرے سے کندھے اچکائے۔

"کیا مطلب؟"اس کا دائیاں ابرو اٹھا۔

"وہ ملک سے باہر ہوتا ہے۔"

"کیوں؟"

"بیچارہ اکتا گیا ہو گا اپنے لوگوں کی تلخ باتوں سے۔"

"میں سمجھی نہیں۔"الجھ کے ساشا کو دیکھا۔

اس نے گہری سانس لے کے بتانا شروع کیا۔"جس سال نہران پہ وہ بیماری نازل ہوئی تھی،اسی سال شہزادہ حاتم بھی حداد سے لوٹا تھا۔نہران کے لوگ سمجھتے ہیں کہ شہزادہ منحوس ہے۔ان پہ عذاب لایا ہے۔اس لیے اپنے ملک میں کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔بلکہ سب اس سے نفرت کرتے ہیں۔"

اس کی آنکھوں کے سامنے ایک مرتبہ پھر درخت کے تنے سے ٹیک لگائے، لکھائی میں مگن شہزادے حاتم کا چہرہ لہرایا۔اتنے حسین چہرے سے بھلا کوئی نفرت کیسے کر سکتا ہے؟

"لوگوں نے اس کا جینا حرام کرر کھا تھا۔اس لیے وہ دو برس پہلے حداد واپس چلا گیا۔ لیکن ایک برس پہلے غابانوی حکومت نے ایک نیا قانون تشکیل دیا تھا۔ جس کے مطابق کسی بھی قدرتی عمل کو کسی ایک انسان کی قسمت سے منسلک کرنے کو ممنوع کر دیا گیا تھا۔اس قانون کے مطابق کوئی بھی اگر بیماری کو شہزادے کے ساتھ منسلک کرے گا یا حتی کہ کھلے عام اس بات کا تذکرہ بھی کرے گا تو وہ سنگین نتائج کا مستحق ہو گا۔"رک کے لیلیٰ کی طرف دیکھا۔ جس کی سبز آنکھوں میں بے یقینی اور افسوس کے ملے جلے تاثرات تھے۔

"اب ان لوگوں نے اس کی حب الوطنی پہ سوال اٹھانا شروع کر دیئے ہیں۔" ساشا نے ناگواری سے سر جھٹکا۔"مگر تمہیں یہ سب کیسے پتہ ہو گا۔اپنی ماں کی وجہ سے تم نے تو غابانیہ سے کبھی کوئی تعلق ہی نہیں رکھا۔"

"اب جاتو رہی ہوں۔"اس نے تلملا کے فوراً اپنا دفاع کیا۔

"جب تمہاری ماں مر رہی ہے۔"ساشا بھی اسی کے انداز میں بولی۔

"تم نے اپنا رویہ دیکھا ہے کبھی سلطان خالد کے ساتھ۔ کس قدر قابل اعتراض

انداز میں پیش آتی ہو تم ان کے ساتھ۔اس پر کبھی غور کیا ہے؟"لیلیٰ نے اسے احساسِ ندامت دلانا چاہا۔

"میرا اور ان کا معاملہ تم سے اور تمہاری ماں سے مختلف ہے۔"اس نے لاپروائی ظاہر کی۔

"پھر بھی تمہیں تھوڑی شرم کرنی چاہیے اور...."

"مجھے نصیحتیں کرنا بند کرو۔"ساشا نے بغل میں پڑا کشن اٹھا کے اس کے منہ پہ مارا۔

"نہیں کروں گی۔"چلاتے ہوئے لیلیٰ نے وہی کشن اس کی طرف اچھالا تھا۔

وہاں اب ایک جنگِ عظیم شروع ہونے لگی تھی۔

www.novelsclubb.com

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(موجودہ دن سے چھ ماہ قبل۔)

نہران۔

پانچ سرنگوں والے جنگل میں موجود غار،دیوار پہ لگی مشعل کی مدھم روشنی میں

نہائی ہوئی تھی۔وہ دونوں تھوڑی دیر قبل ہی اس زخمی چیتے سے نمٹنے کے بعد غار میں واپس آئے تھے۔حاتم اپنی بھیگی ہوئی شرٹ کا کونا پکڑے اس میں سے پانی نچوڑ رہا تھا۔اور نقاب پوش کھانے کا انتظام کر رہی تھی۔

وہ چار پانچ دن سے نہایا نہیں تھا۔اسے کوفت محسوس ہونے لگی تھی۔عموماً وہ دن میں کم از کم ایک مرتبہ تو ضرور نہاتا تھا اور اب اس گندگی میں رہ کر اسے ناقابل برداشت الجھن کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔وہ بہت صفائی پسند تھا۔اس جیسے انسان کے لیے پانچ دن نہائے بغیر گزارنا کسی عذاب سے کم نہیں تھا۔شرٹ کو نچوڑتے ہوئے اس کا اوپری بٹن نکل گیا تو اسے پینٹ کی جیب میں ڈالنے کے لیے ہاتھ اندر ڈالا۔اگلے لمحے وہ ٹھٹھکا۔

www.novelsclubb.com

اس نے گردن پھیر کے نقاب پوش کی طرف دیکھا۔وہ پوری طرح سے اپنے کام میں مصروف تھی۔حاتم نے دھیرے سے ہاتھ باہر نکالا جس میں ایک ننھی سی شیشی تھی۔اسے یاد آیا،زین سے ملنے جانے سے پہلے وہ ایک قیدی سے تفتیش کر رہا تھا۔اور شیشی میں موجود مائع قیدیوں کو ذہنی اور جسمانی اذیت دینے کے لیے

استعمال کیا جاتا تھا۔اس کی دو چار قطروں سے انسان کا جسم مفلوج ہو جاتا تھا۔حاتم کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔اس نے شیشی واپس جیب میں ڈالی اور چولہے سے ذرا ہٹ کر رکھی لکڑی کی چوکی پہ بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد نقاب پوش کھانا پروسنے لگی۔اس نے شوربے سے بھرا مٹی کا ایک کٹورا اس کے سامنے رکھا۔جس میں گوشت کے نام پہ میں ہڈیاں تیر رہی تھیں۔حاتم نے برا منہ بنایا۔پھر چمچ اٹھا کے آہستگی سے اسے پینا شروع کر دیا۔(اتنا بھی بدذائقہ نہیں ہے۔)

نقاب پوش بھی اس کے سامنے بچھی چوکی پہ بیٹھ کر اپنے کٹورے میں سے شوربا پینے لگی۔ساتھ اس نے باجرے کی گول روٹی بھی بنائی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد حاتم نے جان بھوج کر زور سے کھانسنا شروع کر دیا۔وہ کھانا چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوئی۔الجھن بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"پانی....مجھے پانی چاہیے۔"گلا پکڑے،بدقت رک کر جیسے اپنی عرض اس کے سامنے رکھی۔

وہ اٹھ کر مٹکے کی طرف پانی لینے چلی گئی۔حاتم نے پھرتی سے شیشی کو جیب سے نکالا۔اور دو چار قطرے اس کے کٹورے میں شامل کر دیئے۔

وہ واپس آئی اور گھٹنوں کے بل اس کے پاس بیٹھی۔ مٹی کا گلاس اس کے منہ سے لگایا۔حاتم پانی پی چکا تو وہ اپنی جگہ پر واپس بیٹھی اور دونوں ایک مرتبہ پھر کھانے میں مصروف ہو گئے۔

وہ سب کام بہت پھرتی سے کرتی تھی۔ کھانا بھی وہ حاتم سے پہلے ہی ختم کر چکی تھی۔اس نے محسوس کیا وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہی ہے۔اسے اس کی نظریں اپنی روح تک اترتی محسوس ہو رہی تھیں۔(کیا اسے شک ہو گیا ہے؟)

وہ ذرا کھنکھارا۔

"دل تو نہیں آ گیا مجھ پر؟" طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

نقاب پوش نے جواباً تپا دینے والی مسکراہٹ چہرے پہ سجائی۔"کیوں تم کوئی نہران کے شہزادے ہو جو تم پر دل آ جائے گا؟ ویسے بھی خوبصورت لڑکیوں کا عام شکل مردوں پر دل نہیں آتا۔"

www.novelsclubb.com

اس کی بات پہ حاتم کو دھچکا لگا۔اسے آج تک کسی نے عام شکل نہیں بلایا تھا۔ بچپن سے ہی سب اسے خوبصورت نقوش والا شہزادہ کہتے تھے۔اور وہ اچھا خاصا خوبصورت تھا بھی۔ لیکن اس چورنی نے کتنی آسانی سے اسے عام شکل قرار دے دیا تھا۔

"میں تمہیں عام شکل لگتا ہوں؟"دانت پیستے ہوئے پوچھا۔

سبز آنکھوں والی لڑکی نے آگے جھک کے،آنکھیں چھوٹی کیے اسے غور سے دیکھا۔پھر واپس سیدھی ہو کے بیٹھی اور افسوس سے نفی میں سر ہلاتی بولی۔"ہاں میرے مقابلے میں تمہاری شکل کچھ اتنی خاص نہیں ہے۔"

"اتنی بھی خوبصورت نہیں ہو تم۔"حاتم اس کا تبصرہ سن کے جیسے اندر تک جل اٹھا تھا۔

"ہاں،بس شہزادی سا شا جتنی خوبصورت ہوں۔"وہ جواباً گردن کڑائے بولی۔

حاتم نے نگاہ اٹھا کے سبز آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا۔وہ اس کے چور ہونے کی حقیقت کو بالائے طاق رکھے اسے دیکھ رہا تھا۔اور شاید پہلی مرتبہ ہی اس نظر سے

دیکھ رہا تھا۔اس کی ہر ادا میں اعتماد جھلکتا تھا۔وہ کسی بھی زاویے سے چور نہیں لگتی تھی۔اس نے شہزادی ساشا کو کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس کے سامنے بیٹھی بااعتماد لڑکی....اگر وہ خوبصورت ہونے کی دعوے دار تھی تو اس کا دعوہ غلط نہیں تھا۔وہ خودستائش لڑکی اپنے منہ سے اپنی خوبصورتی کی تعریف کر رہی تھی۔اور اب جب وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا تو وہ اسے واقعی خوبصورت لگی تھی۔مگر اتنی بھی نہیں کے اس کی ہاں میں ہاں ملا کے اس چالاک لومڑی کے اعتماد کو ہوا دیتا۔

"آئینہ ہے کیا یہاں؟"اس نے گردن اطراف میں دوڑاتے پوچھا۔گو کہ اسے یقین تھا کہ اس کے پاس آئینہ ہو گا۔کیونکہ ضروریات زندگی کی ہر چیز اس غار میں موجود تھی۔وہ نڈر لڑکی اس خطرناک جنگل میں رہائش پذیر جو تھی۔

"ہاں کیوں؟"وہ ذرا سا الجھی۔

"جا کر اس میں شکل دیکھو اپنی۔آئی بڑی شہزادی ساشا سے مقابلہ کرنے والی۔"

یہ بات سن کر اس چورنی کے اندر تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔اس کا چہرہ غصے سے دہکنے لگا۔اس نے حاتم کے آگے سے کٹورا اٹھا لیا۔اس کے ہاتھ سے چمچ بھی کھینچ

لی۔وہ ابھی تک اپنا کھانا ختم نہیں کر سکا تھا۔

"یہ کیا تھا؟" بے یقینی سے اس کا منہ کھل گیا۔

"جتنا کھالیا ہے، اتنا کافی ہے۔" سرد مہری سے کہتی اٹھ گئی۔

حاتم لب بھینچے، غار میں موجود بستر نامی پتھر پر آ کے بیٹھ گیا۔البتہ نظریں اس نقاب پوش چورنی پر ہی تھیں۔وہ اس کی طرف پشت کیے، کچھ جڑی بوٹیوں کو صاف کر کے رکھ رہی تھی۔

(ابھی تک اس کے ہاتھ پاؤں مفلوج ہو جانے چاہیے تھے۔آخر اسے ابھی تک کچھ ہوا کیوں نہیں تھا؟)

"سنو؟" اس کی طرف دیکھے بغیر وہ بولی۔

"فرماؤ۔"

"اگر میں کہوں کہ میں شہزادی ساشا کی دوست ہوں تو میرا یقین کر لو گے؟" اس کی آواز مصروف سی سنائی دی۔

حاتم کو اس بیچاری کی حسرتوں پر دل ہی دل میں رحم بھی آیا اور ہنسی بھی۔

www.novelsclubb.com

"نہیں۔الٹا میں سمجھوں گا کہ تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ بڑھاپا ابھی سے ظاہر ہونے لگا ہے۔"

وہ چوکی پہ حاتم کی طرف گھومی اور سلگتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تو تمہارے خیال میں، میں شہزادی کی دوست نہیں ہو سکتی؟"

"ہو سکتی ہو۔ مگر خواب میں۔اچھا خواب ہے۔دیکھتی رہو۔"مصنوعی سنجیدگی سے اس کی حوصلہ افزائی کی۔

اس نے جوابی وار کے لیے منہ کھولا مگر پھر شاید ارادہ بدل دیا۔ مسکراتے ہوئے سر جھٹکا اور گود میں رکھی ٹوکری میں جڑی بوٹیاں صاف کرنے لگی۔حاتم کو اس کی مسکراہٹ کی وجہ سمجھ نہیں آئی۔

www.novelsclubb.com

وہ بظاہر کام میں مگن دکھائی دیتی تھی مگر گاہے بگاہے نظر اٹھا کے حاتم کو بھی دیکھ رہی تھی۔حاتم کی پُر سوچ نظریں بھی لاشعوری طور پر اسی پر ٹکی تھیں۔وہ اس پہ زہر کے اثر انداز ہونے کا منتظر تھا۔

(اسے کچھ ہو کیوں نہیں رہا ہے؟ کیا یہ اتنی سخت جان ہے کہ زہر بھی اس پہ اثر

نہیں کرتا؟)

"کیا سوچ رہے ہو؟" وہ ذرا محتاط ہو کر بیٹھی۔

حاتم فوراً سنبھلا۔(اُف۔ پتہ نہیں وہ اسے کب سے گھور رہا تھا!)

"تم نے کہا تھا تمہیں تیرنا نہیں آتا۔"

"ہاں، تو؟" اس نے دونوں ہاتھ باہم پھنسا کر گھٹنوں پر رکھے۔

"تو یہ، کہ اگر تم سے چھٹکارا حاصل کرنا ہو تو تمہیں سمندر میں دھکا دے دیا جائے؟"

نقاب پوش کی آنکھیں استہزاء سے چمکیں۔ وہ تھوڑی گھٹنوں پہ دھرے ہاتھوں پہ جمائے، آگے ہو کر بیٹھی۔ "اور تمہیں یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ اس کے بعد مجھ سے نجات مل جائے گی۔ تمہیں ساتھ لے کر ڈوبوں گی۔"

"فی الحال تو تمہارا دماغ ڈوبنے والا ہے۔ اندھیروں میں۔"

"کیا مطلب؟" اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"میرا مشورہ ہے، یہاں آ کر لیٹ جاؤ۔" وہ خود بستر سے اٹھا اور اسے وہاں آنے کا

اشارہ کیا۔

اس کے چہرے پہ الجھن ابھری۔

"تمہارے اگلے چند گھنٹے بہت تکلیف میں گزرنے والے ہیں۔" حاتم کے چہرے پر سنجیدگی در آئی۔

"کیا، کیا ہے تم نے؟" گردن پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ اچھل کے چوکی سے اٹھی۔

حاتم نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم نے میرے کھانے میں کچھ ملایا ہے؟" وہ اپنا گلا پکڑے بے یقینی سے بولی۔

"میں تم سے کہہ رہا ہوں نا یہاں آ کر لیٹ جاؤ۔" انداز میں خفگی بھری تنبیہ تھی۔

وہ اس کے اور اپنے درمیان کا فاصلہ عبور کر کے اس کے قریب آئی۔

"پہلے تم مجھے بتاؤ، تم نے کیا ملایا ہے میرے کھانے میں؟" وہ اس کے گریبان پر جھپٹتے ہوئے غرائی تھی۔

اس کے ہاتھ وہیں جم گئے۔ہلنے ہلانے سے قاصر۔اپنے ہاتھوں کو منجمد محسوس کرنے پہ اس نے انہیں حاتم کے کالر سے ہٹانا چاہا۔وہ نہیں ہٹا پائی۔

"یہ میرے ہاتھوں کو کیا ہوا ہے؟"وہ بوکھلائی۔

پھر اس نے اپنے پاؤں ہلانا چاہے۔وہ بھی نہ ہلے۔اس نے ہونٹ ہلانے چاہے۔ وہ ہلا نہ سکی۔

اس نے سبز، کانچ نظریں اٹھا کر حاتم کو دیکھا۔ان میں نظر آنے والا تاثر ایک لمحے کے لیے حاتم بن خیام کے دل کو مٹھی میں لے گیا۔ایسا ہی تاثر اس نے سات برس قبل بھی دیکھا تھا۔اپنے کسی دل عزیز کی آنکھوں میں۔اعتبار ٹوٹنے کا تاثر۔ دھوکا ملنے کا تاثر۔پیٹھ پہ خنجر لگنے کا تاثر۔مگر سامنے کھڑی لڑکی اس کی کوئی دل عزیز نہیں تھی۔وہ ایک چور تھی۔اس کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔وہ جو کر رہا تھا وہ ٹھیک تھا۔وہ اسے اس ملعون جنگل سے باہر نکالنے کو تیار نہیں تھی۔اپنی بقا کے لیے، یہ کوشش اس کا پہلا اور آخری موقع تھی۔

اس نے گہرا سانس لے کے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں پہ رکھے۔وہ شدید

ٹھنڈے پڑ رہے تھے۔اس نے دھیرے سے نقاب پوش کے ہاتھ اپنے گریبان سے ہٹائے۔اسے دونوں کندھوں سے تھام کر بستر پہ لٹایا۔وہ اب اس کی آنکھوں میں نہیں دیکھ رہا تھا۔دیکھ ہی نہیں پا رہا تھا۔لاشعوری طور پر اسے یہ ڈر تھا کہ کہیں وہ اپنا ارادہ نہ بدل دے۔

اپنی محسن کو اس بے بس حالت میں چھوڑ کے وہ غار کی تلاشی لینے لگا۔سب سے پہلے اس نے نقاب پوش کا تھیلا دوبارہ کھول کر دیکھا۔اسے ایک نقشے کی تلاش تھی۔اتنے بڑے جنگل میں رہنے کے لیے کسی ماہر کو بھی ایک نقشہ درکار تھا۔اور حاتم کو پورا یقین تھا کہ اسے اس جنگل کا نقشہ اسی غار میں کہیں ملے گا۔اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اسے ایک پتھر کے نیچے سے مل گیا۔اس نے نقشہ کھول کے دیکھا۔ اس کی معلومات کے مطابق پانچوں سرنگوں میں سے ایک سرنگ محل تک جاتی تھی۔مگر کون سی سرنگ تھی یہ اسے یاد نہیں تھا۔نقشے کے مطابق،دائیں جانب سے دوسرے نمبر والی سرنگ تھی،جو محل کے اندر ختم ہوتی تھی۔

نقشہ ہاتھ میں اٹھائے،وہ چل کر بستر کے قریب آیا۔ایک گہرا سانس لیا۔بہت

ہمت مجتمع کیے بے بس حالت میں بستر پہ پڑی لڑکی کی آنکھوں میں دیکھا۔وہاں حیرانی، غصہ، تنفر، سب کچھ بیک وقت تھا۔ایک لمحے کے لیے حاتم کا دل پگھلا۔ اس لڑکی نے اس کی جان بچائی۔اتنے دنوں تک اس کا خیال رکھا۔اور وہ بدلے میں اس کے ساتھ یہ کر رہا تھا؟ یہ صلہ دے رہا تھا؟ کیا وہ صحیح کر رہا تھا؟

(نہیں، نہیں۔یہ وہ کیا سوچنے لگا تھا۔)اس نے ذہن سے ہمدردی کے خیالوں کو جھٹکا۔

وہ لڑکی چور تھی۔قیمتی جڑی بوٹیوں کی تسکری میں ملوث تھی۔اس کے ملک کے ساتھ مخلص نہیں تھی۔حاتم کے لیے، کیا ارادے رکھتی تھی،اس بات سے بھی وہ لاعلم تھا۔وہ اس کے لیے ایک چلتا پھرتا خطرہ تھی۔اس سے جان چھڑوا لینے میں ہی مصلحت تھی۔

اس نے دونوں ہاتھ پیچھے باندھے اور چہرے کے تاثرات کو سنجیدہ رکھے، کہنا شروع کیا۔وہ غابانوی فوج کے ایک رائڈ (میجر) کی آواز تھی۔

"تم نے میری جان بچائی،اس کے لیے میں تمہارا احسان مند ہوں۔لیکن میں

لوگوں کے احسان نہیں رکھتا۔اس لیے میری بات دھیان سے سنو۔" وہ دو قدم مزید آگے بڑھا اور سنجیدگی سے کہنے لگا۔"میں یہاں سے جانے کے بعد نقاب پوش کی مخبری کروں گا۔ لیکن سپاہیوں کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ انہیں جس کی تلاش ہے، وہ تم ہو۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ آئندہ، میرے شہر میں تو کیا، میرے ملک میں بھی نظر مت آنا۔"

حاتم نے رک کر اس کی سبز آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں پانی ٹھہرا تھا۔ جیسے صبح سویرے درختوں کے ہرے پتوں پر شبنمی قطرے ٹھہرے ہوں۔

"صرف دو دن ہیں تمہارے پاس۔ اپنا سامان سمیٹو اور چلتی بنو یہاں سے۔ دو دن بعد سپاہی اس جگہ کی تلاشی لینے آئیں گے۔ اگر جان پیاری ہے تو اس سے پہلے یہاں سے چلی جانا۔ ورنہ ایک طویل عرصے کے لیے زندان میں سڑنے کے لیے تیار رہنا۔ الوداع!" آخر میں ہاتھ ماتھے تک لے کر گیا۔ اس کے بعد پلٹ گیا۔

غار سے نکلنے سے پہلے اس نے وہ سارے پتے بھی اٹھا لیے جو اس مخصوص بیماری کے علاج کے طور استعمال ہوتے تھے۔ جنگلات غابانیہ کا قیمتی اثاثہ تھے۔ اور ان

میں پائی جانے والی ادویات اس کے محبوب وطن کا خزانہ۔اور اپنے ملک کا خزانہ وہ کسی چور کو ہتھیانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔

اس نے دیوار پہ لگی مشعل اتاری اور دوسرے نمبر والی سرنگ کی طرف بڑھا گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قلبلار۔

جھیل کے اوپر بنے، دو پہاڑوں کو آپس میں ملانے والے لکڑی کے اس قدیم اور طویل پُل کے تختے برسوں کی دھوپ اور بارش کے باعث نرم پڑ چکے تھے۔دو دن پہلے ہوئی برفباری کے اثرات تھے جو فی الوقت برف علینہ کے قدموں تلے آہستگی سے لڑکھڑاتے تختوں پہ کسی ہموار چادر کی طرح سجی تھی۔

نیلی جھیل کافی حد تک پگھل چکی تھی۔البتہ کہیں کہیں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے تیرتے دکھائی دیتے تھے۔

یہ غروبِ آفتاب سے چند گھڑیاں قبل کا وقت تھا۔نیلا آسمان گلابی، نارنجی اور

جامنی رنگوں کی موٹی لکیروں سے آراستہ تھا۔فاصلے فاصلے پہ سفید بادل بھی نظر آتے تھے۔آس پاس کے پہاڑوں اور آسمان کا عکس،پل تلے موجود بے حس و حرکت جھیل کے شفاف پانی کی سطح پہ اپنی چھاپ چھوڑتے ہوئے اس حسین نظارے کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہا تھا۔لیکن دکھ کی بات تو یہ تھی کہ قدرت کے کمال کا یہ لازوال منظر بھی علینہ کے آزردہ دل کو راضی نہیں کر سکا۔اس کی زخمی روح کو تسکین نہیں بخش سکا۔اس کے خودکشی کی ایک اور کوشش کے ارادے کو بدل نہیں سکا۔

اب تو اسے گنتی ہی بھول گئی تھی کہ وہ کتنی مرتبہ جھیل میں کود کر اپنی جان لینے کی کوشش کر چکی ہے۔وہ ماضی کی پشیمانیوں میں گھری ہوئی لڑکی تھی۔اس کا دل اس دنیا سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

جس جگہ وہ کھڑی تھی یہاں سے پُل کا حفاظتی جنگلہ ٹوٹا ہوا تھا۔وہ ہمیشہ یہیں سے چھلانگ لگایا کرتی تھی۔یہ جھیل کا وسط تھا جہاں سے وہ گہری ترین تھی۔لیکن علینہ پھر بھی نہیں مرتی تھی۔جب پانی کے اندر سانس لینا مشکل ہو جاتا تو وہ باہر

نکل آتی۔ مر جانا آسان ہوتا ہے۔اور غلطیوں کے پچھتاووں کے ساتھ زندہ رہنا، بہت مشکل۔ لیکن علینہ کو تو آسان کام بھی مشکل لگتے تھے۔ وہ مرنے کی کوشش کرتی تھی تو اس کی بزدلی اسے مرنے نہیں دیتی تھی۔ جب موت قریب آتی تھی تو وہ پیچھے ہٹ جاتی تھی۔ ڈھیٹوں کی طرح جھیل سے باہر نکلتی تھی تو سامنے وہی اذیت آمیز زندگی ہوتی تھی جس سے تنگ آکر وہ مرنے کا ارادہ باندھتی تھی۔ یہ اذیت اس نے اپنے لیے چنی بھی تو خود ہی تھی۔ اب ساری زندگی بھگتنا بھی خود ہی تھا۔ کچی عمر کی ایک نادان غلطی اس کے لیے پکا روگ بن گئی تھی۔

اس نے اپنا لیدر کا تھیلا کندھے سے اتار کے ایک طرف رکھا۔ اور آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ ابھی قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ اپنی کہنی پہ کسی کا لمس محسوس کر کے ایک جھٹکے میں آنکھیں کھول دیں۔ گردن پھیر کے اپنے دائیں جانب دیکھا تو دو نیلی آنکھیں اس کی آنکھوں سے ٹکرائیں۔

پس منظر میں نظر آتے نیلے آسمان جیسی۔ اس کے قدموں تلے موجود نیلی جھیل جیسی۔ شفاف۔ زندگی سے بھرپور۔ گہری۔ اتنی گہری کہ لوگ ان میں ڈوبنے کی

خواہش کریں۔ لیکن علینہ اب کسی لڑکے کی آنکھوں میں ڈوبنے کی متحمل نہیں تھی۔ نہ اس کی ایسی کوئی خطرناک چاہت تھی۔ اور نہ ہی اس میں اتنی سکت باقی تھی۔

"خودکشی حرام ہے۔" اس نے جس نرمی سے علینہ کی کہنی تھام رکھی تھی اسی نرمی سے چھوڑ دی۔

وہ زیتونی رنگ کی وردی میں ملبوس کوئی چوبیس پچیس سالہ خوش شکل سا لڑکا تھا۔ سیاہ بال سلیقے سے سنوار رکھے تھے۔ کمر کے گرد بندھے بھورے بیلٹ میں فوجی ٹوپی مقید تھی۔ وردی سے وہ غابانیہ کے اعلیٰ فوجی حکام کا اہلکار معلوم ہوتا تھا۔ علینہ کی نظریں اس کے چہرے سے ہوتی ہوئیں سینے پہ چپکی لوہے کی سیاہ پٹی (نیم پلیٹ) تک گئیں۔ اس پہ سنہری رنگوں میں تین حروف پہ مشتمل ایک نام لکھا تھا۔

زین۔

"مجھ پر زندگی بھی حرام ہے۔" وہ سامنے خلا میں دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"ایسا مت کہو۔ زندگی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی ناقدری مت کرو۔ میں نہیں

جانتا ایسی کیا وجہ ہے جس نے تمہیں اس مقام پہ لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کوئی بھی وجہ اتنی بڑی نہیں ہوتی جو انسان جان جیسی نعمت کی ناشکری کرنے پہ اتر آئے۔" وہ بہت نرم گو تھا۔ بے حد تحمل مزاجی سے بات کرتا تھا۔

"میری زندگی تو زحمت ہے۔" اس نے تلخی سے محض سوچا، کہا نہیں۔

ماحول کے سناٹے میں صرف زین کی آواز گونج رہی تھی۔ "اور ایسا کہہ کر میں تمہارے دکھ کو معمولی بالکل بھی نہیں کہہ رہا۔ یقیناً تمہارا غم بہت بڑا ہے۔ لیکن ایک مرتبے ٹھنڈے دماغ سے سوچو، جو کھو گیا ہے وہ واپس لوٹ آئے گا۔ ورنہ جان گنوا کے کبھی کوئی اپنے دکھوں سے آزاد نہیں ہو پایا۔ یہ سب تو دنیاوی دکھ ہیں۔ حقیقی دکھ تو مرنے کے بعد شروع ہوتے ہیں۔"

وہ علینہ کو دیکھ رہا تھا اور وہ جھیل میں نظر آتے اس کے مدھم سے عکس کو۔

"جو میں نے کھویا ہے، وہ کبھی واپس نہیں لوٹے گا۔" اس کی آواز میں زمانے بھر کی اداسی سمٹی تھی۔

"چیزوں کو تھوڑا وقت دو۔ کہتے ہیں وقت سارے زخم بھر دیتا ہے۔" وہ نرم آمیز سنجیدگی سے بولا۔

"کچھ زخم کبھی نہیں بھرتے۔ وہ زندگی بھر کا روگ بن جاتے ہیں۔" علینہ کے حلق میں کڑواہٹ گھل گئی۔

"میرا ماننا ہے کہ وقت سب کچھ ٹھیک کر دیتا ہے۔"

"اور اگر وقت ہی برا ہو تو؟" وہ اس کی طرف مڑی۔

"وقت اچھا ہو یا برا، آخر میں اس نے گزرنا ہی ہوتا ہے۔" اس مرتبہ وہ پھیکا سا مسکرایا۔ وہ پہلی مرتبہ مسکرایا تھا۔

علینہ کے چہرے پہ بھی تلخ سی مسکراہٹ واضح ہوئی۔ "کہنے والے کے لیے آسان ہوتا ہے۔ مشکل تو اس کے لیے ہوتی ہے جس نے سہنا ہوتا ہے۔ تمہاری زندگی یقیناً بہت پُر سکون گزر رہی ہے۔ اسی لیے تو یہاں کھڑے مجھے نصیحتیں کر رہے ہو۔ خود کی زندگی میں کوئی دکھ ہوتا تب میں تم سے پوچھتی کہ تمہارا وقت گزر رہا ہے یا نہیں؟"

اس کی آنکھوں میں زخمی پن سا اترا۔ لیکن اگلے لمحے وہ کھل کے مسکرایا۔ مرہمی سی مسکراہٹ تھی اس کی۔ یوں کہ جب وہ مسکراتا تھا تو اس کی شوخ آنکھیں بھی مسکراتی تھیں۔ جیسے زندہ دلی اور شادمانی کے دو چمکدار تالاب ہوں۔

"ارے.... تم تو ذاتیات پر آ گئیں۔"

یکدم تیز ہوائیں چلیں تو قلبلار کا آسمان گھٹاؤں سے بھرنے لگا۔ شام کے آسمان پہ بکھرے شوخ رنگ مندمل پڑنے لگے۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے رنگین آسمان مکمل طور پر سرمئی بادلوں کی اوٹ میں چھپ گیا۔

علینہ نے رُخ واپس سامنے کی طرف پھیر لیا۔ اور خاموش جھیل کو دیکھنے لگی۔

"جیسا کہ میں نے پہلے بھی بتایا، میں تمہارے غم کو چھوٹا نہیں کہہ رہا۔ انسانوں کے روئیوں کے پیچھے گہری کہانیاں ہوتی ہیں۔ کوئی بلاوجہ اتنا بڑا قدم کبھی نہیں اٹھاتا۔ لیکن خودکشی کوئی بہادری کا کام نہیں ہے۔ نہ ہی کسی مسئلے کا حل ہے۔ یہ زندگی تو عارضی ہے۔ اصل جہان تو اس کے آگے ہے۔ چند دن کی زندگی سے تنگ آ کر اپنی ابدی زندگی کو برباد مت کرو۔ جذباتیت کے بجائے عقلیت سے کام لو۔"

وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بات کر رہا تھا۔

آخری جملے پہ علینہ کے چہرے کا رُخ بے ساختہ اس کی طرف ہوا۔ ہواؤں کے باعث اس کے سلیقے سے سنورے بال اب ماتھے پہ بکھر چکے تھے۔ علینہ کے اپنے بال بھی بار بار چہرے کے آگے آتے تو وہ انہیں کان کے پیچھے اڑستی۔

"تم مجھے نامعقول کہہ رہے ہو؟" بے یقینی سے ابرو اٹھایا۔

"میں تمہیں جذباتی کہہ رہا ہوں۔" اس نے فوراً وضاحت کی۔

دفعتاً آسمان پہ بادل گرجے تو لکڑی کا پل لمحے بھر کے لیے لرز اٹھا۔ اور پھر آسمان سے تڑاتڑ برستی بوندوں کا نزول ہوا۔ جیسے ہی بارش کی پہلی بوندیں نیلی جھیل کی سطح پہ گریں، اس میں سمٹے سارے عکس دم توڑ گئے۔ بارش کی گول لہریں پیدا ہونا شروع ہوئیں تو بے حس و ساکت جھیل ٹپ ٹپ کے راگ سے جی اٹھی۔

ان دونوں کے درمیان پانی کی بوچھاڑ آگئی تو سامنے کھڑا زین دھند کے پردے میں لپٹ گیا۔

"ایک تو قلبلار اور یہاں کا غیر متوقع موسم۔" بارش کے قطروں کے درمیان

اس کی قدرے جھنجلائی ہوئی آواز کانوں سے ٹکرائی۔یقیناًاسے بارش پسند نہیں تھی۔

اس نے نجانے کہاں سے ایک نیلے رنگ کی چھتری نکالی اور لمحے کی بھی دیر کیے بغیر اسے اپنے اوپر تان لیا۔

پھر وہ دو قدم آگے بڑھ کے قریب ہوا تو نیلے رنگ کا چھت علینہ کے اوپر گرتے قطروں کی راہ میں رکاوٹ بن گیا۔وہ دونوں اس چھتری کے سائے تلے ایک دوسرے کے بے حد نزدیک کھڑے تھے۔زین کے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ علینہ کے چہرے پر بھی بھیگی لٹیں پھیلی تھیں۔وہ دونوں مکمل طور پہ بھیگ چکے تھے۔

www.novelsclubb.com

"کیا میں تمہیں قائل کرنے میں کامیاب ہوا؟"اس نے دھیرے سے علینہ کا ہاتھ اوپر کر کے چھتری کا ہتھ اس کے ہاتھ میں دیا اور خود پیچھے ہو گیا۔بارش اسے ایک مرتبہ پھر بھگونے لگی۔وہ بنا پلک جھپکے اس کا چہرہ تکتی رہی۔

نجانے کتنی دیر تک؟

"اس خاموشی کا میں کیا مطلب لوں؟" وہ پھر سے مسکرایا۔ نیلی آنکھوں کے کونوں پہ جھریاں سی بنیں۔ اس کی مسکراہٹ سورج کی اس ننھی کرن جیسی تھی جو ابر آلود آسمان کو چیر کے دھرتی پہ گرتی ہے۔

اگر وہ ایک اور پل اس مسکراتے چہرے کو دیکھتی رہتی تو اس کا مردہ دل پھر سے دھڑکنے لگتا۔

"اُف۔ اب انسان اس ملعون شہر میں چین سے مر بھی نہیں سکتا۔" خفگی اور اُجلت سے کہتی اس کے قریب گئی۔

"پکڑو اپنی چھتری، مجھے نہیں چاہیے۔" چھتری جبراً اسے واپس تھمائی اور نظریں اٹھا کے دوبارہ اس کا مسکراتا چہرہ دیکھنے کی حماقت نہیں کی۔ اپنا بھیگا ہوا تھیلا اٹھایا اور پُل پہ آگے بڑھ گئی۔

واپسی کے راستے پر جگہ جگہ زین کے قدموں کی چھاپ تھی۔ وہ فوجی تھا۔ یقیناً پُل کے اس پار، پہاڑوں کے بیچ و بیچ بنے سلطان حاکم کے پرانے محل جا رہا تھا۔

جوں جوں علینہ آگے بڑھتی گئی اس کے قدموں کے نشان بھی برف کی سفید

چادر پہ سجتے گئے۔

اُس سمت سے آتے، زین کے قدموں کے نشان۔اوراِس سمت سے جاتے، علینہ کے قدموں کے نشان۔وہ مخالف سمتوں کے راہی تھے۔

بدستور برستی بارش کے موٹے قطرے ابھی تک نیلی جھیل کی سطح پہ رقص کرتے اسے زندگی بخش رہے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قلبلار۔

گذشتہ ہفتے تیز بارش کے باعث قلبلار کی سرزمین پہ بچھی سفیدی کی چادر کافی حد تک پگھل چکی تھی۔وسیع وعریض کھڑکیوں سے جھلکتی سورج کی تیز کرنوں نے قلبلار کے مرکزی کتب خانے کا کونا کونا منور کرر کھا تھا۔یہاں تک کے دھول کے معلق ذرات سورج کی مدھم شعاعوں میں اڑتے، کتب خانے کی خلا کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کرتے نظر آتے تھے۔

آسمانی رنگ کے چمکتے نقش ونگار، سنگ مرمر کے شفاف فرش پہ بچھے قیمتی

قالینوں اور سنہری محرابوں سے مزین یہ کتب خانہ قلبلار کی حسین ترین عمارتوں میں سے ایک تھا۔ فضا میں جدید صفحات پہ نقش کیے گئے قدیم الفاظوں کی مہک رچی بسی تھی۔

وائل کونے میں موجود ایک کھڑکی کے ساتھ دیوار کی طرف منہ کیے ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا تھا۔ وہ پوری کی پوری دیوار طویل آئینے سے آراستہ تھی۔ جس میں اسے اپنے پیچھے کا منظر عکس کی صورت بخوبی نظر آرہا تھا۔

آئینے کے آگے میز کرسیاں بچھے تھے جو دیوار کے دوسرے سرے تک جاتے تھے۔ دیوار عین وسط میں سے ٹوٹ جاتی تھی کیونکہ اس جگہ کتب خانے کے دوسرے حصے میں جانے کے لیے چھوٹے دروازے لگے تھے۔

اس کے بائیں جانب کھلی کھڑکی سے آتی سورج کی کرنیں آئینے سے ٹکراتی اپنی چمک کے نشان چھوڑتیں تو ان کا عکس وائل کی آنکھوں میں بھی ابھرتا۔ جس کے باعث سرمئی آنکھیں خود بخود سکڑ جاتیں۔ بالآخر اس نے تنگ آ کے کھڑکی کے آگے پردہ گرادیا تو کرنوں کا راستہ رک گیا۔ سیدھا ہو کے بیٹھنے پہ اسے احساس ہوا کہ

آئینے میں ہلکی سی لرزش ہوئی ہے۔ مگر آئینہ کیسے ہل سکتا تھا۔ وہ تو دیوار میں پیوست تھا۔ اس نے گردن موڑی اور آنکھیں چھوٹی کر کے اپنے پیچھے والے ریک کو دیکھا تو تصدیق ہوئی کہ اس کی بنیاد کے کچھ کیل اور پیچ ڈھیلے ہو چکے ہیں۔ آئینے میں اسی کا عکس ہلتا نظر آیا تھا۔

اس نے افسوس سے پیچ کیا اور سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ اس کی بلا سے جو بھی اس کے نیچے آ کے مر جائے۔

وہ گردن پیچھے گرا کے، آنکھیں بند کیے سکون سے اپنے ملاقاتی کا انتظار کرنے لگا۔

کتب خانے میں مکمل سکوت چھایا تھا۔ صرف کہیں کہیں اکا دکا لوگ نظر آتے تھے۔ وہ دن گزرے زمانے بیت گئے تھے جب قلبلار کے کتب خانے اور درس گاہیں لوگوں سے بھری رہتی تھیں۔ آج کا قلبلار دو دہائیاں پہلے والے قلبلار سے مختلف تھا۔

"سنیں کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟" دفعتاً کسی نے اس کا کندھا تھپکا تو وہ

کرنٹ کھا کے سیدھا ہوا۔جب بھی کوئی اسے بغیر اجازت کے ہاتھ لگاتا تھا تو اسے سخت چڑچڑاہٹ محسوس ہوتی تھی۔

اس نے تلملا کے گردن گھمائی تو ایک لڑکی کو خود سے مخاطب پایا۔

"مجھے وہ کتاب نکال کے دے سکتے ہیں؟"اس نے پیچھے بنی کتابوں کی بھول بھلیاں کی طرف اشارہ کیا۔جہاں اونچے چھت سے قدرے نیچے تک جاتے لکڑی کے تختوں کی قطاریں بنتی تھیں جن میں ہر قسم کی کتابوں کا ذخیرہ تھا۔بھولی ہوئی تہذیبوں کی قدیم تحریروں سے لے کر افسانوی اور حقیقی جادوگروں کی املا کی کتابوں تک۔

"میرا ہاتھ وہاں تک نہیں پہنچ رہا۔"اس نے عاجزانہ انداز میں وضاحت کی۔

وائل نے بیزاری سے سانس بھر کے گردن واپس موڑی۔اور میز پہ پڑی کتاب کھول کے اپنے آگے کر لی۔اس لڑکی کا منہ بے یقینی سے کھل گیا۔کچھ دیر وہ متحیر نگاہوں سے کھڑی اسے دیکھتی رہی۔پھر اس کی مصروفیت کے ناٹک پہ زیرِ لب کچھ بڑبڑاتی وہاں سے چلی گئی۔

اس نے کتاب بند کر کے واپس میز پہ رکھ دی۔ پیچھے مشقت سے کتاب نکالتی لڑکی کا عکس آئینے میں مسلسل نظر آ رہا تھا۔(کیا یہ کتابوں کا سارا ڈھیر لکڑی کے تختوں سمیت اس پہ گرے گا یا یہ خوش قسمتی کسی اور کے حصے آئے گی؟)

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے چھلانگ لگا کے مطلوبہ کتاب نکالی۔ کتاب تو اس کے ہاتھ میں آ گئی مگر ساتھ ہی ساتھ تختے پہ موجود تین چار موٹی کتابیں بھی اس کے سر میں آ کے گریں۔

وائل اپنی کرسی سے ہلا تک نہیں۔

"آہ۔" وہ درد سے کراہ کے بے اختیار زمین پہ بیٹھی۔

اسے تھوڑی مایوسی ہوئی تھی۔ کہاں وہ پورا کا پورا ریک اس کے اوپر گرنے کا انتظار کر رہا تھا اور کہاں....

خیر۔ اس نے سر جھٹکا۔

یہ اس کا ملاقاتی آخر کہاں رہ گیا تھا؟

وہ اٹھ کے خارجی دروازوں کی طرف آیا۔ جہاں فرش سے قدرے اوپر لکڑی

کے چند پٹ (خلائی دروازے) ایک قطار میں لگے تھے۔ وہ خلائی پٹ دونوں ہی طرف کھل جاتے تھے۔

وائل نے ایک قدم مزید آگے بڑھایا تھا جب نظر سامنے سے آتی لڑکی پہ پڑی۔ اسے دیکھتے ساتھ ہی اس کے جبڑے کی رگیں تن گئیں۔ ناپسندیدگی سے پیشانی پہ چند لکیریں بھی پڑیں۔

پچھلے کچھ دنوں سے وہ لڑکی ضرورت سے زیادہ ہی نظر میں آ رہی تھی۔ آتے جاتے، راستوں میں۔ اٹھتے بیٹھتے، غزال میں۔ یہاں تک کہ سوتے جاگتے، خیالوں میں بھی۔

گلابی رنگ کے لمبے لباس اور سفید دوپٹے میں ملبوس وہ مصروف سے انداز میں، کندھے پہ لٹکتے تھیلے میں سے کچھ نکالتی اسی دروازے کی طرف آ رہی تھی جس میں سے وہ گزرنے والا تھا۔ بائیں جانب سے پہلے نمبر والا۔

اس کے قدم خود بخود دوسرے نمبر والے دروازے کی طرف مڑ گئے۔ اس نے دروازے پہ ہاتھ رکھا۔ مگر پھر ایک خیال کے تحت رک گیا۔ یہ سچ تھا کہ وہ اسے

بالکل بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ لیکن اس کی وجہ سے وہ اپنے راستے کیوں بدلتا؟ خود پر کسی بھی طرح سے اثرانداز ہونے کا اختیار وہ کسی کو نہیں دیتا تھا۔ پھر اسے کیوں دے رہا تھا؟

(او نہوں۔) نفی میں سر ہلاتا وہیں سے الٹے قدموں واپس مڑا۔ آندھی طوفان کی طرح پہلے نمبر والے دروازے کو باہر کی طرف کھولا۔ عین اسی وقت امیرہ نے بھی دروازے پہ ہاتھ رکھ کے اسے اندر کی طرف کھولا تھا۔ ایک ہی دروازے کے دو پٹ جو بیک وقت مخالف سمتوں میں کھلے تھے۔

اور اگلے لمحے وہ دونوں بری طرح سے آپس میں ٹکرائے تھے۔ امیرہ کے ہاتھ میں موجود کتاب، جسے اس نے چند پل قبل ہی اپنے تھیلے میں سے نکالا تھا، زمین پہ گر گئی۔ لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی وہاں رکا نہیں تھا۔ جس رفتار سے جا رہا تھا۔ اسی رفتار میں آگے بڑھ گیا۔

"بدلحاظ انسان۔" پیچھے سے اس کی خفگی بھری بڑبڑاہٹ فضا میں گونجی تھی۔ لیکن اس نے پرواہ نہیں کی۔ اسے اس سے بدتر صفات سے پکارا جاتا تھا۔ اس کے

مقابلے یہ تو پھر انتہائی مہذب لفظ تھا۔

وہ باہر آیا تو اس کے ملاقاتی کی آمد کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔

اسے شدید غصہ آیا۔اسے سخت نفرت تھی ان لوگوں سے جو وقت کی پابندی نہیں کرتے تھے۔اگر اس کا اپنا مطلب نہیں ہوتا تو وہ ایک منٹ کا بھی انتظار نہ کرتا۔

وہ جھنجلاہٹ کے عالم میں واپس اسی مخصوص میز کے آگے آ بیٹھا۔

"میں نے پچھلے کچھ دنوں سے انسانی جسم کے درجہ حرارت پہ مختلف کتابیں پڑھی ہیں۔" مدھم سی ایک شناسا آواز کانوں میں گونجی تو گردن بے اختیار اوپر کی طرف اٹھی۔ چھت اور دیوار کے درمیان خلا تھا۔اس طرف کی گئی باتوں کی آواز اس طرف بھی آ رہی تھی۔

"اور کہیں یہ لکھا ہوا نہیں آیا کہ شدید ٹھنڈ میں کسی انسان کا جسم اتنا گرم ہو سکتا ہے۔"

وائل کی ساری حسیں بیک وقت جاگی تھیں۔وہ چوکنا انداز میں قدرے آگے

جھک کے بیٹھا۔

"امیرہ تم کتنی بااعتماد ہو کہ اس کا ہاتھ گرم تھا؟" استفہامیہ تاثر سے بھرپور یہ آواز کسی مرد کی تھی۔

اسے لگا تھا اس نے یہ آواز پہلے بھی کہیں سنی ہے۔ مگر کہاں؟

"سو فیصد۔" لہجے میں اعتماد کی جھلک تھی۔

وہ دونوں بے حد آہستہ آواز میں بات کر رہے تھے۔ مگر وائل تو سرگوشیاں بھی سن لیتا تھا۔

"تمہیں پورا یقین ہے نا کہ اس رات تم نے الادین کو ہی دیکھا تھا؟" آدمی جیسے تصدیق چاہتا تھا۔

www.novelsclubb.com

(اُف۔الادین۔) اس نے ضبط سے بند مٹھی منہ پہ رکھے سانس لیا۔ (اتنی بڑی غلطی کیسے کر سکتا ہے وہ؟ ایک چشم دید گواہ چھوڑ دیا؟)

"اور کتنی مرتبہ بتاؤں عاصم؟" وہ جھنجلائی تھی۔

عاصم؟ اوہ خدایا۔ عاصم بن اسلام۔ اسلام بِن احمد کا بیٹا۔

وہ قلبلار کا ایک شرطہ اہلکار (پولیس آفسر) تھا۔ وہ مہینوں سے وائل کے پیچھے ہاتھ دھو کے پڑا تھا۔ اب یہ دونوں مل کر اس کے خلاف کون سی کھچڑی پکا رہے تھے؟

وہ تھوڑا اور آگے ہو کے بیٹھا۔ گردن ٹیڑھی کر کے کان دیوار کی طرف لگایا۔

"مجھے وہ عام انسان نہیں لگتا۔" سرگوشی جیسی آواز میں کچھ تھا جو وائل کو بہت سرد لگا تھا۔ "آج تک وہ لوگوں کی نظروں میں نہیں آیا۔ اس کا جسم ضرورت سے زیادہ گرم تھا۔ ہو نہ ہو وہ جزیرہِ سحر...."

"نہیں امیرہ۔" عاصم نے فوراً اسے ٹوکا۔ "اتنا آگے نہیں جانا ہمیں۔"

"مگر...."

"اگر مگر کچھ نہیں امیرہ۔ اُس دنیا کے لوگ اِس دنیا میں نہیں آتے۔ اور اِس دنیا کے لوگ اُس دنیا میں نہیں جاتے۔" آواز مزید مدھم ہو گئی تھی لیکن وہ ایک ایک لفظ ٹھہر ٹھہر کے ادا کر رہا تھا۔ "ہماری دنیا کے گنے چنے لوگوں کے علاوہ باقی باسی تو یہ جانتے بھی نہیں کہ وہاں انسانوں کا بصیرہ ہے۔" گفتگو میں پراسرا سا توقف آیا۔ "جادوئی انسانوں کا بصیرہ۔ جن کی رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ جادو بھی دوڑتا

ہے۔"

وائل نے اپنے ہاتھ کی نمایاں رگوں پہ انگلیاں پھیریں۔

"جادو؟"لب میکانکی انداز میں ہلے تھے۔

"آئندہ یوں کھلے عام اس بات کا تذکرہ کبھی مت کرنا۔"عاصم کے لہجے میں واضح تنبیہ تھی۔

امیرہ نے گہرا سانس لیا تھا۔"تم وائل بن آدم کو گرفتار کیوں نہیں کر سکتے؟ سب جانتے ہیں وہ ایک مجرم ہے۔پھر قلبلار کی قانونی طاقتیں اسے گرفتار کیوں نہیں کرتیں؟"

اس کی آنکھیں تعجب سے پھیلیں۔چہرے کے تاثرات بگڑے۔آخر اس لڑکی کا مسئلہ کیا تھا؟ وائل نے تو اس کا کچھ بگاڑا بھی نہیں تھا۔پھر اس کی گرفتاری کو لے کر وہ اتنی جذباتی کیوں سنائی دیتی تھی؟

"سب جانتے ہیں کہ وہ ایک مجرم ہے۔لیکن کسی کے پاس اس کے جرائم کے ثبوت نہیں ہیں،امیرہ۔"عاصم کی مایوس زدہ سی آواز اسے اپنی سوچوں سے باہر

لائی۔"اس کے بازیگروں کی گواہی کی قانون کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ وہ سب اس کے غلام ہیں۔ بھلے ہی وہ ان کے ساتھ غلاموں والا سلوک نہیں کرتا لیکن ہمارے قانونی نظام میں وہ سب غلاموں کے طور پہ ہی درج ہیں۔ اور غلام کی اپنے مالک کے خلاف گواہی عدالت میں قبول نہیں ہوتی۔"

"اس طرح تو وہ کبھی بھی پکڑا نہیں جائے گا۔"امیرہ کے لہجے کی بے چینی نے وائل کو کافی حد تک بے چین کر دیا تھا۔ کیا انجانے میں اس نے اس لڑکی کا کوئی نقصان کیا تھا؟

"ضرور پکڑا جائے گا۔ بس اس کا الادین مل جائے ہمیں۔ وہ اس کا غلام نہیں ہے۔ الادین کی غلامی کے کوئی قانونی کاغذات ہمارے نظام میں موجود نہیں ہیں۔ صرف ایک وہی ہے جسے وہ اپنے برابر کا سمجھتا ہے۔ اس کی گواہی عدالت میں قابلِ قبول ہو گی۔ تم دیکھنا میں وائل بِن آدم کو اسی کے سب سے خاص بندے کے ہاتھوں برباد کروں گا۔"اس کے پر عزم انداز پہ وائل کا نچلا لب طنزیہ مسکراہٹ میں ڈھلا۔

پھر آنکھوں میں قہر اترا اور وہ دانت پہ دانت جمائے منہ میں بڑبڑایا۔ "جیسے تمہارے باپ کا راج ہے نا۔"

ان دونوں کی آوازیں آنا بند ہو گئیں تو وہ اٹھا اور اپنا کوٹ درست کرتا خلائی دروازوں کی طرف بڑھا۔ آگے سے وہ دوبارہ آتی دکھائی دی تو اس نے بڑے محتاط انداز میں اس کی نظر سے بچ کے رُخ واپس پھیر لیا۔ جلد بازی میں میز پہ پڑی کتاب کھولی اور اسے چہرے کے آگے کر کے آرام دہ سے انداز میں بیٹھ گیا۔

اس نے کتاب ذرا سی نیچے کر کے آئینے میں جھانکا۔ وہ ایڑیاں اوپر اٹھائے پیچھے بنے تختوں میں سے چھٹے نمبر والے تختے پہ پہنچنے کی کوشش کرتی نظر آئی۔

یکدم آئینے میں نظر آتے عکس میں حرکت پیدا ہوئی۔

اگر لکڑی کے خانوں سمیت، کتابوں کا سارا ملبا اس کے اوپر گرے تو وہ....

اس کی نظریں اتفاقیہ طور اپنے جوتوں پہ پڑیں تو وائل بِن آدم نے اپنے قدموں کو مڑا ہوا پایا۔ جیسے اٹھنے سے پہلے کسی کے پاؤں فطرتاً مخالف سمت مڑتے ہیں۔

اس کے گلے میں گلٹی سی ابھر کے ڈوبی۔ اس نے سانس روکے نظریں اٹھا کے

دوبارہ آئینے میں دیکھا۔ جس میں نظر آتا عکس ایک مرتبہ پھر ہلا تھا۔ دو چار کتابیں بھی کہیں اوپر سے گری تھیں۔

ہاتھوں میں مقید کتاب یکدم بند ہوئی تھی۔ اگلے لمحے اس نے خود کو کرسی پیچھے دھکیل کے برق رفتاری سے اٹھتا کھڑا پایا۔ اور پھر وہ بے اختیار امیرہ کی طرف بھاگا تھا۔

"لڑکی پیچھے ہٹو۔" کوئی کتب خانے کے کسی حصے سے امیرہ پر چلایا تھا۔ اس کی آواز پورے ہال میں بازگشت کر کے واپس لوٹی تھی۔ وہ شاید وہی لڑکی تھی جو تھوڑی دیر قبل وائل کے پاس آئی تھی۔

مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ کتابوں کا وہ پورا ریک ہموار حرکت میں نیچے کی طرف جھکا۔

اس کے قدم گزوں کا فاصلہ لمحوں میں طے کر کے امیرہ تک پہنچے۔ بائیں ہاتھ نے اسے کلائی سے پکڑ کے پیچھے کیا۔ وہ خود گھوم کے نیچے جھکتے ریک کی طرف پشت کر کے کھڑا ہوا۔ وہ ایک ایسی لڑکی پہ گرتی کتابوں کی راہ میں رکاوٹ بنا کھڑا تھا جسے

وہ شدید ناپسند کرتا تھا۔اور اس نے کچھ بھی ارادتاً نہیں کیا تھا۔وہ سب جیسے خود بخود ہوتا گیا تھا۔اور کیوں ہوا تھا اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

اس نے دائیاں ہاتھ ہوا میں بلند کر کے اپنے پیچھے گرتے تختے کو مضبوطی سے پکڑا۔وہ خلا میں ہی رُک گیا۔

لیکن روانی سے گرتی کتابوں کا ایک جھرنا سا چمکتے فرش پہ بچھے قالین سے ٹکرایا تھا۔ قالین سے اٹھنے والی دھول نے فضا کو خاک کا میدان بنا دیا تھا۔خاکی ذروں کی چبھن سے وائل کی سرمئی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔

کمر، گردن اور سر پہ وزن دار لکڑی کے تختے ایسے کھبے تھے کہ جسم کے مختلف حصوں میں درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔مگر وہ کمال صبر سے ضبط کر گیا۔

آہستہ آہستہ کتابوں کی زمین سے ٹکرانے کی گرج مدھم ہوتی گئی۔یہاں تک کے ہر طرف مکمل سناٹا چھا گیا۔

اس کی آنکھیں کچھ دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔لیکن کان سب سن رہے تھے۔اپنی تیز دھڑکنوں کا تلاطم۔امیرہ کی ناہموار سانسوں کا تسلسل۔فضا میں باقی ساری

آوازیں جیسے دم توڑ گئی تھیں۔ صرف ان دونوں کے تیز رفتاری سے دھڑکتے دلوں کی گونج تھی جو باقی رہی تھی۔

آنکھوں کے آگے چھایا غبار چھٹ گیا تو وائل نے آنکھیں کھولیں۔

سامنے کا منظر نظروں میں قید ہوا۔

وہ دونوں کتابوں کے ملبے کے بیچ و بیچ ایک دوسرے کی قربت میں کھڑے تھے۔اس کا بائیاں بازو امیرہ کے سر کے گرد حائل تھا۔وہ جھکی گردن اور بند آنکھوں کے ساتھ اس کے کوٹ کے کالر کو مضبوطی سے پکڑے اپنی جگہ منجمد کھڑی تھی۔اور وہ اس کے آگے ایک حفاظتی دیوار بنا کھڑا تھا۔

اسے اپنے سر کی پشت پہ نمی سی محسوس ہوئی۔شاید پچھلے ہفتے والا زخم کھل گیا تھا۔اس کے قیمتی خون کی ایک موٹی بوند بالوں میں سے سرکتی ہوئی، کنپٹی سے بہہ کے امیرہ کی پیشانی پہ گری تھی۔

اس نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور نظر اٹھا کے وائل کو دیکھا۔وائل کی نظر ان آنکھوں میں ہی ٹھہر گئی۔

گہرے سنہری اور بھورے رنگ کا امتزاج، وہ آنکھیں ایسی تھیں جیسے پگھلے ہوئے سونے میں گھرا بھورا زرقون ہو۔

وہ پہلی مرتبہ اس کی آنکھیں اتنے قریب سے دیکھ رہا تھا کہ ان میں جھلکتا اپنا عکس واضح دکھائی دیا تھا۔

لیکن پھر.... کسی کی تلخ یاد اسے کھینچ کر اس لمحے کے فسوں سے باہر لائی تھی۔

یکدم وہ سنہری آنکھیں اسے قابل نفرت لگنے لگیں۔

وہ آنکھوں میں شکر گزاری کی رمق لیے، ابھی تک اسے ویسے ہی دیکھ رہی تھی۔

اس نظر سے اسے شدید گھٹن محسوس ہوئی تھی۔ آنکھوں میں غضب جیسے تاثرات نے جنم لیا تھا۔ لب اتنے زور سے بھنچے تھے کہ کنپٹی کی رگیں تک نمایاں ہو گئی تھیں۔

اس نے درشتی سے اپنا ہاتھ امیرہ کے سر سے ہٹایا۔

"گریبان چھوڑو میرا۔" لہجہ تھا یا پتھر اسے خود بھی فرق محسوس نہ ہو سکا۔

اس کی آنکھوں میں پہلے الجھن ابھری۔ پھر تعجب۔ پھر اپنی صورتحال کا شعور۔

اور اگلے لمحے وہ کرنٹ کھا کے اس سے دور ہٹی تھی۔

کتب خانے کی انتظامیہ کے لوگوں نے جلدی سے آ کے ریک کو سنبھالا تھا۔

وہ سیدھا ہو کے کھڑا ہوا اور چند گہرے سانس لے کے اپنے تیز تنفس کو پُر سکون کیا۔ سر سے خون ہنوز ٹپک رہا تھا۔اس نے ہاتھ سر کی پشت پہ پھیرا تو وہ خون سے رنگ گیا۔

پھر دانت ضبط سے جمائے تنفر آمیز نگاہوں سے امیرہ کی طرف دیکھا۔

"یہ آنکھیں سجاوٹ کے لیے نہیں،استعمال کے لیے دی گئی ہیں۔" وہ کسی طوفان کی طرح اس کے سر پہ جا کے غرایا تھا۔جواباً وہ سہم کے بے اختیار پیچھے ہوئی تھی۔

www.novelsclubb.com

وہ جانتا تھا اس کی غلطی نہیں ہے۔کتب خانے کی انتظامیہ کی غلطی تھی۔ان لوگوں کی لاپروائی کی وجہ سے کسی کی جان جا سکتی تھی۔لیکن اسے اس وقت شدید غصہ آ رہا تھا۔رگوں میں دوڑتے خون کی رفتار بڑھ گئی تھی۔

"اگر ہاتھ نہیں پہنچ رہا تھا تو کسی سے مدد مانگ لیتیں۔تمہارے قدمیں کوئی کمی

نہیں آجاتی۔" وہ اسی پتھریلے لہجے میں اس پہ گرج رہا تھا۔

"تم مجھ پر کیوں چلا رہے ہو؟" اس نے سادہ سے انداز میں احتجاج کیا۔

" صحیح کہا تم نے، میں تم پر کیوں چلا رہا ہوں۔" اس نے ٹھوڑی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے سر کو اوپر نیچے ہلایا۔" مجھے تو ان غیر ذمہ دار لوگوں پہ چلانا چاہیے۔" اس کا رجوع انتظامیہ کے عملے کی طرف ہوا۔" تم لوگوں کو میں نہیں چھوڑوں گا۔ تم لوگوں کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے پہ مقدمہ چلاؤں گا۔ عدالت میں گھسیٹ کے تمہارا یہ کھنڈر کتب خانہ بند نہ کروایا تو میرا نام بھی...."

"دیکھیں محترم آپ شانت ہو جائیں۔ یہ صرف ایک حادثہ تھا۔" عملے کے ایک فرد نے نرم لہجے میں بات سنبھالنا چاہی۔

"تمہارے اس حادثے کے چکر میں میری جان چلی جاتی۔" وہ جواباً اس پہ غرایا تھا۔

"میں آپ کے جذبات...."

"جو کرتا ہے، کرنے دو اسے یار۔" ساتھی کارکن نے اس کی بات کاٹی۔" دیکھتے

ہیں کون سا پہاڑ توڑ لے گا۔"

یہ سن کے تو جیسے اس کا دماغ ہی گھوم گیا۔ وہ افسوس سے ہنسا۔ اسے اس کارکن کی بے باکی پر واقعی افسوس ہوا تھا۔

"پہاڑ تو میں واقعی نہیں توڑ سکتا۔ مگر اور بہت کچھ توڑ سکتا ہوں۔ دیکھنا چاہو گے؟" اس نے رک کے اس کارکن کے تاثرات دیکھنے کا انتظار نہیں کیا۔ غیر استہزائیہ انداز میں مسکراتا ہوا ریک کے پاس گیا۔ راستے میں ڈھیر ساری کتابیں اس کے پاؤں تلے کچلی گئی تھیں، لیکن اس نے کوئی احترام نہیں دکھایا۔ اس کے لیے کتابیں ردی کے پلندوں سے بڑھ کے کچھ نہیں تھیں۔ جو اسباق اسے اس کی زندگی نے سکھائے تھے وہ سیاہی سے لکھے الفاظ نہیں سکھا سکتے تھے۔

اس نے دونوں ہاتھ ایک تختے پہ جمائے اور پوری قوت سے اسے سامنے کی طرف دھکیلا۔ کتابیں تو ویسے بھی ساری نیچے گر گئی تھیں۔ اور اگر نہ بھی گرتیں تو وائل بِن آدم میں اتنی طاقت تھی کے ردی سے بھرے ایک لکڑی کے ریک کو اپنے بل بوتے پہ گرا سکتا۔

وہ ریک قطار میں موجود دوسرے نمبر والے ریک کے اوپر گرا۔دوسرے نمبر والا ریک تیسرے نمبر والے ریک کے اوپر گرا۔اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس حصے میں موجود در کے دس ریک زمین بوس ہو گئے۔

کتب خانے میں جیسے بھونچال نازل ہوا تھا۔فضا میں لکڑی اور کتابوں کی زمین سے ٹکرانے کی بازگشت کی گرج گونج رہی تھی۔مٹی کا سونامی سا فضا سے ٹکرایا تھا۔ہر طرف خاک ہی خاک ہی تھی۔ایسے جیسے کوئی تیز آندھی ہو۔

اسے معلوم تھا اس طرف کوئی بھی نہیں ہے۔نہ بھی ہوتا تو وہ کسی دوسرے کی جان کی پرواہ کیے بغیر وہی کرتا جو وہ کر چکا تھا۔کتب خانے کا ستیاناس۔

وہ فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ واپس پلٹا۔دھول کے باعث کسی کا بھی چہرہ دیکھنے سے قاصر تھا۔مگر سب کے متحیر تاثرات تصور کر سکتا تھا۔حیرت سے پوری کھلی آنکھیں جواب یقیناً خاک کی چبھن سے بند ہو چکی ہوں گی۔منہ پہ پھیلے ہاتھوں کے پیالے۔اور خاموش آواز میں اسے گالیوں سے نوازتی زبانیں۔

وہ خارجی دروازے سے گزر کے باہر نکل گیا۔اس کے عقب کی فضا میں مسلسل

اڑتی خاک کتب خانے میں موجود لوگوں کو کھانسنے پہ مجبور کر رہی تھی۔

قلبلار کے عفریت کے ہاتھوں، قلبلار کی خوبصورت عمارتوں میں سے ایک وقتی طور پہ کھنڈر بن چکی تھی۔اور یہ سب انتظامیہ کی لاپروائی کے باعث واقعے ہوئے ایک حادثے کا نتیجہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قلبلار۔

آج کے دن کی فجر قضا ہوئے کئی گھڑیاں بیت چکیں تو تازہ صبح کی سفید روشنی غزال کے طویل ہال کی وسیع کھڑکیوں سے گزر کے چمکدار فرش پہ جلوہ فروش ہونے لگی۔آتشدانوں میں آگ بھی ہنوز جلتی دکھائی دیتی تھی۔البتہ ابھی تک کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔

"نہیں حریم۔ق کی آواز حلق سے آتی ہے۔تم قلب کو کلب پڑھ رہی ہو۔ایسے مطلب بدل جاتا ہے۔"

حریم نے ابھی تھوڑی دیر قبل ہی اپنا قہوہ خانہ کھولا تھا اور اب وہ امیرہ سے عربی

زبان کے مخرج کا درس لے رہی تھی۔ پچھلے ہفتے اس نے امیرہ سے قرآن پڑھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔تب سے وہ دونوں ہر صبح کچھ وقت اس کا مخرج درست کروانے میں سرف کرتی تھیں۔

"امیرہ فی الحال میرا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا یار۔پہلے کچھ کھا لیتے ہیں اس کے بعد پڑھیں گے۔"اس نے منت بھرے لہجے میں کہا تو امیرہ نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

اس نے ہاتھ کی مٹھی بنائی اور سر اس پہ ٹکا لیا۔وہ کافی دیر تک اسی حالت میں گم سم سی بیٹھی رہی۔

www.novelsclubb.com

آہستہ آہستہ قہوے خانے میں گاہکوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہونے لگا۔ حتی کہ دفعتاً کوئی اس کے پاس سے گزرا تو اس نے نظر اٹھا کے دیکھا۔

وہ ہمیشہ کی طرح سیاہ لباس میں ملبوس لمبے لمبے قدم اٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ لوگوں کی گردنیں کچھ لمحوں کے لیے بے اختیار اس کی طرف اٹھی تھیں۔امیرہ کی

نظروں نے بھی غیر ارادتاً اس کا تعاقب کیا تھا۔ وہ معمول کے مطابق اسی مخصوص میز کے گرد بچھی واحد کرسی پہ جا کے بیٹھا جس پہ ہمیشہ بیٹھا کرتا تھا۔

صرف ایک لمحے کے لیے امیرہ کی آنکھیں اس کی پُر تپش آنکھوں سے ملی تھیں۔ اور وہاں نظر آنے والا ہر تاثر اس نے پہچانا تھا۔ ناگواری۔ ناپسندیدگی۔ کوفت۔ اس نے درشت انداز میں اپنے آگے اخبار پھیلا لیا تو تیکھے نقوش والا چہرہ چھپ گئے۔

گذشتہ ہفتے کتب خانے میں ادھم مچانے کے بعد بھی وہ کئی مرتبہ اس کی نظروں میں آیا تھا۔ سر کے گرد سیاہ پٹی تب سے باندھ رکھی تھی۔ پتہ نہیں وہ کبھی اترتی بھی تھی یا نہیں؟ اس کے سر کے زخم کبھی بھرتے بھی تھے یا نہیں؟

امیرہ نے پچھلے دو ہفتوں میں اگر اسے پندرہ مرتبہ دیکھا تھا تو دس مرتبہ وہ اس پٹی کے ساتھ ہی نظر آیا تھا۔ پہلے ان لڑکوں سے ہوئی لڑائی کی وجہ سے۔ اور اب پچھلے ہفتے کتب خانے میں ہوئے حادثے کی وجہ سے۔

اگر وہ نہیں ہوتا تو شاید ایک سفید پٹی اس کے سر پہ بھی بندھی ہوتی۔

وہ اب تک سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ اس کے آگے ڈھال بن کے کیوں کھڑا ہوا تھا؟ وہ جانتی تھی وہ اسے بالکل بھی پسند نہیں کرتا۔اور اس کے یہ جذبات یک طرفہ نہیں تھے۔امیرہ کو بھی اس سے برا کوئی دوسرا شخص نہیں لگتا تھا۔ان دونوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے صرف ناپسندیدگی تھی، جو آنکھوں سے صاف جھلکتی تھی۔

لیکن پھر اس نے اسے کیوں بچایا؟

یا شاید وہ یہ جانتا ہی نہیں تھا کہ جسے وہ بچا رہا تھا وہ امیرہ تھی۔ جتنی ناپسندیدگی وہ اس کے لیے ظاہر کرتا تھا اس سے تو یہی لگتا تھا کہ وہ خوشی خوشی اس کے جنازے میں شرکت کرتا۔

www.novelsclubb.com

(ہوں۔یہی ہوا ہوگا۔)اس کے ذہن نے حساب لگایا۔

اچانک کسی نے اس کے دائیں کان کے قریب چٹکی بجائی تو وہ فوراً اپنے ذہن میں بنے سوالوں کے جال سے باہر نکلی۔

"سلام شہزادی۔" ہاتھ میں آدھا کھایا ہوا سیب پکڑے حرم اس کے پیچھے سے

نمودار ہوا۔ گہری سیاہ آنکھوں کو روشن کرتی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے، جس کی وجہ سے گال کا گڑھا ہنوز واضح تھا۔اس کا نام امیرہ ہونے کی وجہ سے وہ آج کل اسے شہزادی بلا کے مخاطب کرتا تھا۔

گہری بھوری آنکھوں اور ہلکے بھورے بالوں والا ایک اور لڑکا بھی اس کے ہمراہ تھا۔امیرہ اسے پہلے بھی کئی مرتبہ حرم اور حریم کے ساتھ دیکھ چکی تھی۔اس کا نام غالباً فیض تھا۔

"فیض کے یہاں بیٹھنے سے تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں؟" کرسی کھینچ کے بیٹھتے ہوئے مروتاً پوچھا۔

"بالکل بھی نہیں۔" اس نے نرمی سے نفی میں سر ہلایا۔

"سلام۔" وہ سنجیدگی سے سر کو خم دے کے حرم کے ساتھ والی نشست پہ بیٹھ گیا۔

"واسلام۔" اس نے بھی گردن کو ہلکی سی جنبش دی۔

"حریم خانم کے پلے کچھ پڑا یا نہیں؟" حرم نے سیب پہ دانت گاڑھے۔

"وہ کوشش کر رہی ہے۔انشااللہ سیکھ جائے گی۔"

"تم سے پہلے فیض کوشش کر کے دیکھ چکا ہے۔تیسرے دن استاد اور شاگرد کی لڑائی ہو گئی تھی۔"وہ فیض کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے ہنسا۔"دیکھتے ہیں تم کب تک پڑھاتی ہو اسے۔"

"میں پڑھالوں گی۔"وہ پلک جھپکا کے تسلی آمیز انداز میں بولی۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"حرم مسکراتے ہوئے اٹھ کر باورچی خانے میں چلا گیا۔

"تم بھی وائل کے لیے کام کرتے ہو؟"امیرہ نے بغور فیض کا چہرہ دیکھتے پوچھا۔

وہ ہلکا سا مسکرایا۔"بدقسمتی سے۔"

www.novelsclubb.com

"اس کے علاوہ کیا کرتے ہو؟"

"خوش ہونے کا انتظار۔"کچھ تھا جو اس کی آواز میں بہت اداس سا تھا۔

"کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ خوش ہوا نہیں جاتا۔خوش رہا جاتا ہے۔اور خوش رہنا ایسا فن ہے جسے سیکھنا پڑتا ہے۔"امیرہ کی نظروں کے سامنے ایک پُر مسرت سا

معصوم چہرہ لہرایا۔

"مطلب؟"فیض نے نظریں اٹھا کے دیکھا تو ان میں ویرانی سی تھی۔

"نہ چاہیں تو محلوں کے مکین بھی خوش نہیں ہو پاتے۔اور چاہیں تو مٹی کے مکانوں میں رہنے والے بھی خوش ہو جاتے ہیں۔خوشی کی چاہت ہر انسان کے اندر ہوتی ہے۔لیکن خوشی انسان کو اپنے اندر ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔"

"پھر کہاں ملتی ہے؟"اس کی آنکھوں میں استفہام ابھرا۔

"اپنے ارد گرد۔"وہ دونوں ہاتھ میز پہ رکھے آگے ہو کے بیٹھی۔"ہم خوشی کو اپنے اندر تلاش کرتے رہتے ہیں اور وہ ہمارے باہر ہوتی ہے۔"

"کیسے؟"

www.novelsclubb.com

امیرہ نے گہری سانس بھری۔"اگر ہمارے دل میں خوشی کی چاہت ہو تو ہم کسی دوسرے کی خوشی میں بھی خوش ہو سکتے ہیں۔ٹھنڈی ہواؤں کو محسوس کر کے بھی خوش ہو سکتے ہیں۔بارش کی بوندوں کے نزول پہ بھی خوش ہو سکتے ہیں۔اور کسی دوسرے کے ساتھ کوئی بھلائی کر کے بھی خوش ہو سکتے ہیں۔"وہ لکڑی کے

میز پہ بنی لکیروں پہ انگلی پھیر رہی تھی۔"لیکن اگر خوشی کی چاہت ہی نہ ہو تو پھر آسائشیں بھی ہمارے دل کو خوش نہیں کر سکتیں۔"

"اس کا تو یہی مطلب ہوا نا کہ خوشی انسان کے اندر ہی ہوتی ہے۔"

"اونہوں...."اس نے مسکراتے ہوئے سر دائیں بائیں ہلایا۔"خوشی کی چاہت انسان کے اندر ہوتی ہے۔خوشی نہیں۔ہم انسان یہی تو غلطی کرتے ہیں۔ہم خوشی کو اپنے اندر موجود اس چاہت میں تلاش کرتے رہتے ہیں۔جبکہ وہ ہمارے ارد گرد کے ماحول میں ہوتی ہے۔اور وہ تلاش کیے بغیر نہیں ملتی۔"اس نے رک کے الفاظ اکٹھے کیے۔"اندر کی چاہت باہر نکلتی ہے تو باہر سے خوشی اندر داخل ہوتی ہے۔تب کہیں جا کے دل کا درد کم ہوتا ہے۔"آخر میں سر اٹھا کے فیض کے سوگوار سے چہرے کو دیکھا۔"تم بھی خوشی کا انتظار کرنے کے بجائے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرو۔شاید تمہیں خوشی مل جائے۔"

"زندگی کو دیکھنے کا اچھا نقطہ نظر ہے۔"اس نے سراہنے والے انداز میں سر کو جنبش دی تو امیرہ ہلکا سا مسکرا دی۔

اس نے گردن دائیں بائیں گھما کے دیکھا تو غزال لوگوں سے بھر چکا تھا۔ حریم کے کم سن خادم لوگوں کو ناشتہ پروس رہے تھے۔ وہ خود نجانے کہاں رہ گئی تھی۔

"حریم کا خانسامہ نہیں آیا آج۔" حرم ان کے میز کے قریب آیا اور دائیں ہاتھ میں پکڑی ٹرے امیرہ کے سامنے رکھی۔ "وہ کہہ رہی ہے تم ناشتہ کر کے چلی جاؤ۔ آج کا دن وہ بہت مصروف رہے گی۔" رسان سے کہتا وہ دوسری ٹرے اٹھائے وائل کے میز کی طرف چلا گیا۔

امیرہ نے چائے کی کیتلی اور پیالیاں ٹرے میں سے اٹھا کے میز کے وسط میں رکھیں۔ پھر اپنی پلیٹ میں انڈا اور پراٹھا رکھ کے ٹرے فیض کی طرف بڑھا دی۔ اور آرام سے سے ناشتہ کرنے لگی۔

www.novelsclubb.com

"تم دونوں کیا باتیں کرتے رہے؟" حرم واپس آ کے اپنی کرسی پہ بیٹھا۔

"امیرہ مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں وائل کی ملازمت کے علاوہ کیا کام کرتا ہوں؟"

"تو پھر عملی نمونہ دکھاؤ اپنے پیشے کا۔" حرم نے حوصلہ افزا انداز میں فیض کے

کندھے پہ ہاتھ رکھا۔شاید اسے لوگوں کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کے بات کرنے کی عادت تھی۔

امیرہ نے قدرے الجھ کر ان دونوں کو دیکھا۔فیض نے مسکرا کے اپنی پشمی جیکٹ کی جیب میں سے ایک تاش نکالا، جس پہ لال دل بنے تھے۔

امیرہ کے لب اوہ میں سکڑے۔(تو وہ جادو گر تھا۔نظر کے دھوکے والے کرتب دکھاتا تھا۔)

فیض نے تاش کا پتا اپنے ہاتھ کی انگلیوں میں گھمانا شروع کر دیا۔امیرہ نے نظریں ہنوز اس کی انگلیوں کے درمیان رقص کرتے تاش پہ مرکوز رکھیں۔اسے اس لمحے کا انتظار تھا جس میں فیض اس کی بے دھیانی کا فائدہ اٹھا کے پتے کو غائب کر دے گا۔

لیکن فیض کے ہاتھ میں واقعی بہت صفائی تھی۔اس کے ہاتھوں کی حرکات اتنی سریع و محتاط تھیں کہ وہ لمحہ آیا اور امیرہ اسے پکڑ نہیں سکی۔تاش یکدم فیض کے ہاتھ سے غائب ہو گیا۔یوں جیسے سچ مچ کا جادو ہو۔

"آہ۔"اس نے افسوس سے ٹھنڈی سانس بھری۔

فیض نے دونوں ہاتھوں کی تالی بجائی تو تاش ایک مرتبہ پھر اس کی ہتھیلی میں آ گیا۔ اگلے کئی لمحوں تک وہ انتہائی تیزی سے ایک پل تاش غائب کرتا اور اگلے پل واپس لے آتا۔

آخر میں اس نے زور کی تالی بجائی تو تاش مستقل طور پہ غائب ہو گیا۔

"امیرہ اپنے کوٹ کی داہنی جیب کے اندر دیکھنا ذرا۔" چمکتی آنکھوں سے مسکرا کے درخواست کی۔

امیرہ نے انتہائی آہستگی سے دائیاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں ڈالا۔ جب نکالا تو اس میں وہی لال دلوں والا تاش تھا۔

"یہ تم نے کیسے کیا؟" وہ خوشگوار حیرت کا شکار تھی۔

"جادو گر اگر اپنے کرتب کا راز بتا دے تو اس کا کاروبار نہیں چلتا۔" اس نے عاجزی سے مسکراتے ہوئے کندھے اچکائے۔

امیرہ نوالہ منہ میں ڈالنے لگی تو نظر اتفاقیہ طور پہ حرم کے کندھے کے اس پار پڑی۔ اس کا ہاتھ فضا میں ہی رک گیا۔ وائل چلتا ہوا ان کے میز کی طرف آ رہا تھا۔

وہی پُر اعتماد چال جس سے وہ پہچانا جاتا تھا۔وہ چلتا تھا تو لوگ اپنے کام روک کے اسے دیکھتے تھے۔

"آئندہ مجھے چائے پیش مت کرنا۔"قریب پہنچنے پر اس نے چائے کی پیالی حرم کے سامنے تقریباً پٹخنے والے انداز میں رکھی۔ مگر مجال ہے جو ایک بھی بوند اچھل کے میز پہ گری ہو۔

پچھلے چند دنوں سے اس نے دیکھا تھا کہ یہ ایک جملہ وہ حریم کو ہر روز بولتا تھا۔وہ ہر روز اس کے آگے چائے رکھ کے آتی۔اور وہ ہر روز ایک بھی گھونٹ بھرے بغیر پیالی اس کے آگے واپس پٹخ کر جاتا۔اسے چائے پسند نہیں تھی۔اور حریم اس کی اس ناپسند کو بدلنا چاہتی تھی۔

www.novelsclubb.com

امیرہ نظریں اپنے آگے پڑے ناشتے پہ مرکوز رکھتے ہوئے بظاہر اسے نظر انداز کیے کھانے میں مشغول رہی۔ لیکن اس کی موجودگی میں خود کو پُر سکون رکھنا اسے پہاڑ ڈھانے کے مترادف لگتا تھا۔جب وہ آس پاس ہوتا تھا تو دل میں ایک عجیب سا احساس پروان چڑھنے لگتا تھا۔وہ کوشش کے باوجود سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ایسا

کیوں ہوتا ہے؟ وہ ایک قابلِ نفرت انسان تھا۔ اور امیرہ کو اس سے نفرت محسوس ہوتی بھی تھی۔ لیکن پھر یہ احساس؟

عموماً وہ اتنی سی بات کہہ کے چلا جاتا تھا۔ آج نہیں گیا۔ کسی پتھر کی طرح وہیں منجمد ہوا کھڑا رہا۔

"کچھ چاہیے؟" حرم نے نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے استفسار کیا۔

"یہ جو لوگ کہتے ہیں نا کہ خوش رہنا سیکھیں، اپنے ارد گرد خوشی تلاش کریں، یہ سب بکواس کرتے ہیں۔"

سرد آواز کانوں میں گونجی تو امیرہ نے بے اختیار سر اٹھا کے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ وہ دونوں تو انتہائی آہستہ آواز میں گفتگو کر رہے تھے۔ پھر وہ اتنے دور سے ان کی آواز کیسے سن سکتا ہے؟

وہ اسے تحیر سے دیکھ رہی تھی۔ لیکن وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ خلا میں کسی غیر مرئی نقطے پہ نظریں جمائے سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چہرہ بے تاثر تھا۔ اور لہجہ سپاٹ۔

"جو تلاش کرنی پڑ جائے وہ پھر خوشی نہیں رہتی۔ سمجھوتہ بن جاتا ہے۔"

اس کی آواز واقعی اداس تھی یا امیرہ کو لگی تھی؟

وہ اس پہ ایک لمحے کی طوفانی پُر تپش نظر ڈال کے وہاں سے چلا گیا۔

"یہ کسے سنا کر گیا ہے؟" حرم نے باری باری دونوں کو دیکھا۔

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لیکن دونوں ہی کچھ نہیں بولے۔

"خیر جسے بھی سنا کر گیا ہے، کم از کم بولا تو سہی۔" اس نے خود ہی سوال کر کے اسے نظر انداز کر دیا۔ "خوش قسمتی کی گھڑیاں ہوتی ہیں وہ.... جب یہ صاحب کام کے علاوہ بھی ہمارے ساتھ ہم کلام ہوتے ہیں۔ ورنہ تو فالتو بات کرنے کو یہ اپنی توہین سمجھتے ہیں۔" لہجے میں استہزائیہ کاٹ تھی۔

"تم سب میں صرف فیض کو قرآن پڑھنا آتا ہے؟" امیرہ نے نوالہ توڑتے ہوئے عارضی سے انداز میں پوچھا۔

"آتا تو خیر علینہ اور وائل کو بھی ہے۔ لیکن علینہ کسی کو پڑھانا نہیں چاہتی اور سیٹھ

پر کسی کے ساتھ نیکی کرنا ویسے ہی حرام ہے۔" حرم طنز سے گویا ہوا۔

"کیا اسی لیے اس نے اسلام صاحب کا مدرسہ بھی جلایا۔" وہ سوال نہیں تھا۔ نہ ہی طنز تھا۔ شاید شکوہ تھا۔

حرم کے حلق میں پراٹھا پھنسا تھا۔ وہ گلا پکڑ کے کھانستے ہوئے امیرہ کو ایسے تاثرات کے ساتھ دیکھ رہا تھا جیسے موت کو قریب سے دیکھ لیا ہو۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" اس نے جلدی سے پانی گلاس میں انڈیل کے اس کے آگے رکھا۔

اس کے گلے میں گلٹی سے ابھر کے غائب ہوئی تھی۔

"ایک منٹ۔" فیض کو ساتھ بیٹھے حرم کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ امیرہ کو پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ "وائل نے اسلام صاحب کا مدرسہ جلایا؟ ان کا نیا مدرسہ جس کی تعمیر پچھلے چند سالوں سے عمل میں تھی؟"

"صرف یہی نہیں۔ اس نے انہیں تین دن کے لیے جیل میں بھی قید رکھوایا۔" وہ سلگ کے بولی تھی۔

"جیل؟"فیض آہستہ سی آواز میں بڑبڑایا تھا۔

"جی۔آج سے تقریباً چھ ماہ پہلے ان کی دکان پہ ایک لڑکا کام کرتا تھا۔اس پر کوئی الزامات لگے تھے جس کی وجہ سے اسلام صاحب نے بھاگنے میں اس کی مدد کی تھی۔"وہ سوچ سوچ کے بتا رہی تھی۔"تم لوگوں کے سیٹھ وائل بِن آدم نے اسی بات کو بنیاد بنا کے ان کو گرفتار کروایا اور پورے تین دن انہیں جیل میں رکھا۔" امیرہ کو کہتے ہوئے بھی اس سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔"آخر کیا بگاڑا تھا اس بزرگ آدمی نے اس کا؟ان کی برسوں کی محنت پر اس نے لمحوں میں پانی پھیر دیا۔ بلکہ آگ لگا دی۔"

پھر وہ حرم کی طرف متوجہ ہوئی۔"تمہیں کیا ہوا ہے؟یہ پانی پیو۔"اس کے آگے پڑا گلاس اٹھا کے اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

فیض نے کینہ توز نظروں سے حرم کو دیکھا تو اس نے گلاس منہ سے لگائے چہرہ پھیر لیا۔

ماحول میں کچھ تھا جو بدل گیا تھا۔یا شاید امیرہ کا وہم تھا۔

"میں حریم سے مل کے آتی ہوں۔" وہ کھانا ختم کر چکی تو اپنے برتن اٹھائے باورچی خانے کی طرف چلی آئی۔

"تمہاری وہ دوست روز یہاں کیوں آتی ہے؟" اندر داخل ہونے سے پہلے یہ جھنجلاہٹ بھری آواز کانوں سے ٹکرائی تو اس کے قدم چوکھٹ میں ہی تھم گئے۔

"مجھے قرآن پڑھانے آتی ہے۔" حریم کی آواز غیر متاثر سنائی دیتی تھی۔

"تم کسی اور سے پڑھ لو۔"

"تم پڑھا دو۔"

"تم جانتی ہو میں یہ نہیں کروں گا۔"

"پھر اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔ اور مجھ پہ دھونس جمانا بند کرو۔" وہ جھنجلائی۔

وہ دونوں باورچی خانے میں پڑے میز کی مخالف سمتوں میں کھڑے ایک دوسرے سے بحس کر رہے تھے۔ وائل کی اس کی طرف پشت تھی۔ جبکہ حریم کا چہرہ بخوبی نظر آتا تھا۔ امیرہ ذرا اوٹ میں ہو کے کھڑی ہو گئی۔

اسے اس طرح ان دونوں کی باتیں سننا قابلِ اعتراض لگا تھا لیکن موضوعِ گفتگو

وہ تھی۔اسے جاننا تھا کہ وائل بِن آدم کو اس سے کیا مسئلہ ہے اور وہ اس پہ ایسے طنز کیوں کر کے گیا تھا۔

"ریم تم جانتی ہو مجھے مذہبی لوگ زہر لگتے ہیں۔" وہ اکھڑے سے لہجے میں بولا۔

"مجھے کون سا شہد لگتے ہیں۔" وہ بھی اسی کے انداز میں بولی تھی۔

شاید صرف ایک یہی نقطہ تھا جس پہ وہ دونوں اتفاق نظر کرتے تھے۔

"لیکن امیرہ مختلف ہے۔وہ ایک انتہائی ذہین اور قابل لڑکی ہے۔" بھوری آنکھوں میں فخریہ تاثرات نمایاں ہوئے تھے۔

"اس لڑکی میں صرف ایک ہی قابلیت ہے۔اور وہ ہے ہر راہ چلتے کو اپنے علم کا درس دینا۔" وہ اپنے ازلی سنجیدہ انداز میں ایک مرتبہ پھر اس پہ طنز کر رہا تھا۔

ہاتھ میں پکڑی پلیٹ پہ امیرہ کی گرفت مضبوط ہوئی۔اسے وائل بِن آدم کا یہ طنز گراں گزرا تھا۔

"میری دوست کے بارے میں بکواس مت کرو۔" حریم نے بگڑ کے اسے دیکھا تھا۔

"تم اس سے جا کے کہو یہاں آنا چھوڑ دے تو نہیں کروں گا۔" وہ ٹھوس انداز میں بولا۔

"یہ قہوہ خانہ تمہارا نہیں، میرا ہے۔" اس نے سینے پہ انگلی رکھ کے جتایا۔ "میں جسے چاہوں یہاں بلاؤں، جسے چاہوں یہاں سے نکال دوں۔ تم میرے غزال میں کھڑے ہو کے مجھ پہ کوئی روک ٹوک نہیں کر سکتے۔"

"اپنا قہوہ خانہ مجھے بیچ دو۔ بدلے میں، میں تمہارا قرض اتار دوں گا۔" اس نے ہلکے سے شانے اچکا کے تجویز دی تو حریم کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

"میں جانتا ہوں جمن سردار کے لوگ قرضے کی ادائیگی کے لیے تمہارے پیچھے پڑے ہیں۔ میں تمہارا سارا قرض ادا کر دوں گا۔ تم بس اپنا قہوہ خانہ مجھے دے دو۔"

"تاکہ تم میرے غزال کو جواری نشہ آور گنڈے بد معاشوں کا اڈا بنا دو۔" وہ ایک لمحے کے بھی توقف کے بغیر بولی تھی۔ حریم کو اس کے غزال سے زیادہ محبوب کچھ نہیں تھا۔ "مجھے اچھے سے معلوم ہے تمہاری بہت عرصے سے میرے غزال پہ نظر ہے۔ ہتھیانا چاہتے ہو، نا میرا قہوہ خانہ؟ قلب میں تمہیں اپنا جوا گھر کھڑا کرنے کے

لیے کوئی جگہ نہیں مل رہی اس لیے میرے غزال پہ قبضہ جمانا چاہتے ہو۔ لیکن میں تمہیں تمہارے اس مقصد میں کامیاب ہونے نہیں دوں گی، وائل۔" وہ اٹل انداز میں کہہ رہی تھی۔ "تم کوئی مے خانہ خرید و۔ وہاں شراب بھی بیچنا اور جوا گیری کی خدمات بھی پیش کرنا۔" حریم نے سر جھٹکا اور ایک بڑے سے پیالے میں ڈالے انڈے پھینٹنے لگی۔

"میں مر جاؤں گا۔ لیکن شراب فروش نہیں بنوں گا۔"

اس نے رک کے وائل کو افسوس سے دیکھا۔ "شراب پی سکتے ہو، بیچ نہیں سکتے؟ اچھی منافقت ہے۔"

"ریم میں تم سے بحس کرنے کے مزاج میں نہیں ہوں۔ تم اس لڑکی کا یہاں آنا بند کرو گی یا نہیں؟" اس نے جیسے ایک آخری مرتبہ پُرزور انداز میں پوچھا تھا۔

"نہیں۔" حریم نے یک لفظ جواب دے کے جیسے بات ہی ختم کر دی۔ مگر جب وہ وہاں سے ہلا نہیں تو اس نے گہرا سانس لے کے اکھڑ لہجے میں کہا۔ "تمہیں اس سے مسئلہ ہے تو تم یہاں آنا چھوڑ دو۔"

"میں اس کی وجہ سے اپنا معمول کیوں بدلوں؟" وہ ناگواری سے گویا ہوا۔

"تو پھر وہ تمہاری وجہ سے یہاں آنا کیوں چھوڑے؟"

بالکل وہ اس کی وجہ سے یہاں آنا کیوں چھوڑتی۔اسے اتنا حق کیوں دیتی کہ اس کے آنے جانے کی جگہوں میں اس کا اختیار ہوتا۔وہ حریم کے قہوے خانے میں حریم سے ملنے آتی تھی۔اس وائل کو اگر اس سے اتنا ہی مسئلہ تھا تو خود کہیں اور چلا جاتا۔بھلے ہی جہنم میں،اس کی بلا سے۔

اس نے اندر جانے کے بجائے برتن ایک خادم کو پکڑائے اور واپس پلٹ آئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قلبلار۔

www.novelsclubb.com

دوپہر کی سنہری دھوپ ہر سو پھیلی تھی۔دو ہفتے قبل ہوئی برفباری کا کوئی نام و نشان تک موجود نہ تھا۔

شہر کے مرکز میں بنے صدر بازار میں معمول کے مطابق رونق کا عالم تھا۔ دکانوں کے اندر اور باہر لگے ٹھیلوں کے آگے لوگوں نے ہلچل مچا رکھی تھی۔خوانچہ

فروش اونچی صدائیں لگاتے اپنے سامان کی خوبیوں کے گن گا کے راہگیروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہے تھے۔زندگی سے بھرپور وہ بازار قلبلار میں پائی جانے والی دو مختلف دنیاؤں کو آپس میں ملاتا بھی تھا اور ان کے بیچ تفریق بھی کرتا تھا۔اس بازار کا ایک سرا قلب اور دوسرا اشرفاء کے محلے سے ملتا تھا۔

ماحول کی ہنگامہ آرائی میں اعتماد سے چلتا ہوا وائل اپنے آگے گول دائرے کی صورت لگا مجمع دیکھ کر تھم گیا۔اس نے آگے بڑھ کے ایڑیاں اٹھائیں اور درمیان کا منظر دیکھا۔اگلے ہی لمحے وہ اضطرابی کیفیت میں آکر بے اختیار دو قدم پیچھے لڑکھڑایا تھا۔اس کی پُرسکون سانسیں یکدم تیز ہو گئیں۔اس نے دونوں ہاتھ آپس میں ملائے تو وہ اسے پسینے سے تر محسوس ہوئے۔وائل کے قدم خود بخود پیچھے ہٹتے گئے۔وہ اسی اضطرابی حالت میں پلٹا اور تیزی سے جس سمت سے آیا تھا اسی سمت بڑھنے لگا۔ابھی دو گز کا فاصلہ بھی طے نہ کیا تھا کہ اس کے پیچھے ایک بے بس سی صدا بلند ہوئی۔

"خدا کے لیے کوئی میری مدد کرے۔"

اس کے قدم یکدم زنجیر ہوئے۔نہ چاہتے ہوئے بھی ذہن کے پردے پہ ایک تکلیف دہ منظر اجاگر ہونے لگا۔

(وہ بدر کے چاند کی رات تھی۔سفید پردوں سے چھن کے آتی چاندنی نے کمرے کے در و دیوار کو پھیکی سی روشنی بخش رکھی تھی۔کونے میں بچھے پلنگ تلے ایک بچہ سہم کے بیٹھا تھا۔اس خوف زدہ ننھے وجود کی مدھم ہچکیاں فضا کی وحشت ناک خاموشی میں گونجنے والی واحد آواز تھیں۔جیسے خوف کا کوئی نازک سا راگ ہو۔

پھیکی روشنی میں اس کا چہرہ بمشکل واضح تھا۔مگر سرمئی آنکھوں سے بدستور بہتے آنسوں نرم گالوں پہ چمکتے دکھائی دیتے تھے۔اس کی اتھلی سانسیں مارے خوف کے لرز رہی تھیں۔سینے میں مخفی دل کانپ رہا تھا۔

چند لمحے بیتے تھے کہ فضا میں ایک اور پُراسرار گونج کا اضافہ ہوا۔جیسے کسی کے قدموں کی چاپ ہو۔

خاک آلود جوتوں کا ایک جوڑا عین اس کے سامنے آ کے رکا۔ڈری ہوئی سرمئی

آنکھیں گھبراہٹ سے مزید پھیل گئیں۔خوف وہراس کی لپٹ میں آیا سینہ زوروں سے ایک مخصوص تال میں بڑھنے گھٹنے لگا۔

ایک ہیولا سا نیچے جھکا۔اندھیرے کے باعث وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔اس کا دل مزید ڈوبا۔اگلے لمحے آہستگی سے رینگتا ہاتھ اس کے ننھے پاؤں تک آیا۔جس نے اسے ایک ہی جھٹکے میں پلنگ کے نیچے سے باہر نکال پٹخا۔

وہ شخص اب وحشیانہ انداز میں اس کے اوپر کسی لچک دار رسی سے ضربوں کی برسات کرنے لگا تھا۔

بیک وقت اس کے جسم کے مختلف حصوں میں درد کی لہریں دوڑ اٹھیں تھیں۔اسے اپنے جسم پہ نمی بھی محسوس ہوئی تھی۔شاید وہ اس کا خون تھا۔اس نے فطرتاً اپنے دونوں بازو چہرے کے آگے کر لیے تھے۔اس کا انگ انگ تکلیف سے دکھ رہا تھا۔

آدمی کے ہاتھوں کی حرکات میں لرزش تھی۔شاید وہ نشے کی حالت میں دھت تھا۔وہ بیک وقت اس لچک دار رسی سے اسے پیٹ بھی رہا تھا اور گالم گلوچ بھی کر رہا

تھا۔ مگر اس بچے کو تو ان گالیوں کے مطلب تک نہیں پتہ تھے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ مجھے مت مارو۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں بے بسی سے چلایا۔

آدمی یکدم رُک گیا۔

اسے امید کی ایک کرن نظر آئی۔

"تمہارے ماں باپ نے تو کیا ہے نا۔ اور ماں باپ کی غلطیوں کی سزا بچوں کو بھگتنی پڑتی ہے۔" وہ نفرت آمیز آواز میں بول کے ایک مرتبہ پھر اسے مارنا شروع کر چکا تھا۔

امید کی کرن اندھیرے میں کہیں کھو گئی۔

"خدا کا واسطہ ہے مجھے مت مارو۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔"

وہ اس سے ترحم کی بھیک مانگتا رہا۔ مگر اس ظالم شخص کو اس ننھی جان پہ رحم نہیں آیا۔

"خدا کے لیے کوئی مجھے بچائے۔"

وہ مدد کے لیے چلاتا رہا۔ لیکن اس روز کوئی اس کی مدد کو نہیں آیا۔)

منظر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ وائل بِن آدم نے گہرے سانس لے کر خود کو پُر سکون کیا۔ پھر اس نے پسینے سے نم ہاتھوں کو اپنے کپڑوں سے رگڑا۔ اس کے بعد نزدیک لگے ٹھیلے سے لکڑی کا ایک ڈنڈا اٹھایا اور واپس پلٹ گیا۔ لوگوں کے ہجوم میں سے راستہ بناتا گول دائرے کے درمیان آن پہنچا تو منظر پوری طرح واضح ہوا۔

عین وسط میں ایک عمر رسیدہ سفید دھاڑی اور بالوں والا شخص ایک کم عمر بچے کو کوڑے سے پیٹ رہا تھا۔ وہ بچہ یقیناً اس کا غلام تھا۔ اسی لیے تو کوئی بھی اس بھوڑے کو روکنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔

www.novelsclubb.com

بھوڑے نے کوڑا مارنے کے لیے دوبارہ اٹھایا تو وائل نے تیزی سے آگے بڑھ کے اسے ہوا میں ہی روک لیا۔

"چھوڑو اسے۔" آدمی اس کی طرف مڑ کر غرایا۔

"چھڑوالو۔" وہ دانت پہ دانت جمائے بولا۔ اور کوڑے کو ہاتھ پہ لپیٹنا شروع کر

دیا۔

زمین پہ بے بسی کی حالت میں پڑا بچہ فوراً اٹھ کے ایک طرف سہم کے کھڑا ہو گیا۔

بھوڑا آدمی اپنا سارا زور لگانے کے باوجود بھی جب کچھ نہ کر سکا تو آخر تنگ آ کر خود ہی کوڑے کو چھوڑ دیا۔

"اب میں تمہیں تمہاری تخلیق کی گئی دوا کا ذائقہ چھکاتا ہوں۔" استہزائیہ مسکراہٹ اس کے چہرے پہ سجی۔اس نے اپنے سامنے کھڑے بھوڑے آدمی کو زور سے زمین پہ پٹخا۔وہ منہ کے بل نیچے گرا تھا۔

اگلے لمحے اس نے پوری قوت سے ڈنڈا اسے مارنے کے لیے ہوا میں بلند کر دیا۔ مگر وہ اسے لگا نہیں۔وہ ہوا میں ہی رک گیا۔بلکہ روک دیا گیا۔وائل نے تیوری چڑھا کے اپنے دائیں جانب دیکھا تو نظر اس پہ پڑی۔

حریم کی سنہری آنکھوں والی نئی نویلی دوست پہ۔جو ڈنڈے پہ مضبوط گرفت جمائے بغل میں ہی کھڑی تھی۔

"چھوڑو اسے۔"اس کے جبڑے کی رگیں نمایاں ہوئیں۔

"نہیں چھوڑوں گی۔"جواب بہت ضبط سے آیا تھا۔"تمہیں تھوڑی شرم کرنی چاہیے۔تمہارے باپ کی عمر کے ہیں وہ۔"

"لیکن میرا باپ نہیں ہے۔"اس کی سنہری آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کے جواب دیا۔

"احترام نام کی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"اس نے ڈنڈے کو اسی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

وائل پورا کا پورا اس کی طرف گھوما۔اس کا ہاتھ بھی ڈنڈے پر اسی استواری سے جما تھا۔

www.novelsclubb.com

"ہر عمر میں بڑا شخص احترام کا اہل نہیں ہوتا۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر وائل نے اسے بولنے کا موقع نہیں دیا۔

"اس دن حرم کو تو بڑے گیان دے رہی تھیں کہ کچھ برا ہوتا دیکھو تو اسے ہاتھ

سے روکنے کی کوشش کرنی چاہیے۔اب جب میں ایسا کر رہا ہوں تو تمہیں مسئلہ ہے۔یہ تم مذہبی لوگ آخر اتنے منافق کیوں ہوتے ہو؟"وائل کے لہجے میں صرف ایک تاثر تھا۔طنز۔

"ہاتھ سے روکنے کا کہا تھا۔خود ہاتھ چلانے کا نہیں کہا تھا۔"اس کی آواز میں برہمی کا عنصر نمایاں ہوا۔"تمہارے منہ میں یہ جو زبان ہے نا یہ سجاوٹ کے لیے نہیں دی گئی۔ہر مسئلے میں ہاتھوں کا استعمال کرنے کے بجائے اس سے کام لے لو گے،تو تمہارا قد چھوٹا نہیں ہو جائے گا۔زبان انسان کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔"

وائل استہزاء سے مسکرایا۔وہ اسے اسی کے الفاظ لوٹا رہی تھی۔

"یہ لاٹھی کی زبان سمجھنے والی مخلوق ہے امیرہ بی بی،انہیں باتیں سمجھ نہیں آتیں۔"اس نے استہزائیہ انداز میں زمین پہ گرے بھوڑے آدمی کی طرف اشارہ کیا۔

"اور اگر میں بات کر کے معاملہ سلجھا دوں تو؟"اس نے بالآخر ڈنڈا چھوڑ دیا۔

"کوشش کر لو۔مگر یقین جانو تم بری طرح ناکام ہو گی۔"اس نے بے ربطی سے

شانے اچکائے۔

امیرہ اسے تنقیدی نظروں سے دیکھتی زمین پہ جھکی اور بھوڑے آدمی کو کندھوں سے پکڑ کے سیدھا بٹھایا۔اس کا چہرہ واضح ہوا تو وائل نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔

(بہت خوب۔اب یہ آدمی مظلومیت کا ڈھونگ رچائے گا۔)

دونوں ہاتھ پشت پہ باندھے وہ دلچسپی سے سارا تماشا دیکھے گیا۔ڈنڈا ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھا۔

"چچا آپ کا نام کیا ہے؟"نرم لہجہ۔

"شفیق۔"اس کی رندھی سی آواز گونجی۔

"آپ کو پتہ ہے آپ کے نام کا مطلب کیا ہے؟"وہ اس شخص سے بے حد اپنائیت سے مخاطب تھی۔

بھوڑے کی گردن دائیں بائیں ہلی۔

"ہمدردی کرنے والا۔"

www.novelsclubb.com

بھوڑے کی آنکھ سے پانی کا ننھا سا قطرہ بہا۔

"آپ اپنے پوتے کو ایسے کیوں مار رہے تھے؟"

وائل چونکا۔(پوتا؟ تو وہ بچہ اس کا غلام نہیں ہے۔)

"ابھی دو دن پہلے میں نے آپ کو اس کے ساتھ ہنستے مسکراتے دیکھا تھا۔دو دن میں ایسا کیا ہو گیا کہ آپ اپنے گھر کا معاملہ یوں بیچ بازار میں لے آئے؟" وہ بہت میٹھے لہجے میں بات کر رہی تھی۔

بھوڑا آدمی یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔"یہ ذلیل میرے مرحوم بیٹے کی اکلوتی اولاد ہے۔ تین برس پہلے بیٹے کی وفات کے بعد اس کی پرورش کی ذمہ داری میرے اور میری بیوی کے کندھوں پر آ گئی۔ لیکن اس نے ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے۔نہ دل لگا کے پڑھتا ہے۔نہ تمیز سے بات کرتا ہے۔آئے روز لوگوں کے آگے مجھے بے عزت کرواتا ہے۔ ہم جتنی اس سے محبت کرتے ہیں یہ ہمیں اتنا ہی خوار کرنے پر تلا ہے۔"

وائل نے سخت نگاہوں سے ہجوم میں کھڑے بچے کو دیکھا۔اسے فریب اور

حقیقت میں فرق کرنا بخوبی آتا تھا۔ مگر اس ڈیڑھ گز کے بچے کی معصومیت کے آگے وائل بِن آدم کی صلاحیتیں بھی کمزور ثابت ہوئی تھیں۔

"کل اس نے مجھ سے پیسے مانگے تو میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تمہیں ضرورت نہیں ابھی۔ اسی بات پہ اس نے آج صبح اپنی دادی کے زیورات بیچ دیئے۔ وہ بھی آدھی قیمت پر۔ تم مجھے بتاؤ بیٹا میں ایسی اولاد کا کیا کروں؟ کیا اس لیے اسے پال پوس کے بڑا کر رہا ہوں کہ بڑا ہو کر یہ ہمیں بھی بیچ دے؟" بھوڑا دکھ بھری بے بس آواز میں امیرہ کے آگے گڑگڑا رہا تھا۔

"مراد؟" امیرہ نے سہم کے کھڑے بچے کی طرف دیکھ کر پکارا تو وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے پاس آ گیا۔

(تو وہ اسے جانتی ہے۔ اس تماشے میں ضرورت سے زیادہ موڑ تھے۔ بہت دلچسپ!)

"تمہارے دادا سچ کہہ رہے ہیں؟" وہ اس کے ساتھ بھی تحمل مزاجی سے بول رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

اس کی گردن شرمندگی سے جھکی۔

اور وائل کا دل چاہا ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا یہیں سے اس ڈیڑھ گز کے فتور کو دے مارے۔

"چچا مراد نے جو کیا وہ بہت غلط تھا۔ لیکن مار سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ مار سے بچے ڈھیٹ ہو جاتے ہیں۔" وہی میٹھا لب و لہجہ۔

"میں اسے زبان سے سمجھا سمجھا کے تھک چکا ہوں۔ اب مجھ میں سکت باقی نہیں رہی۔"

بھوڑے کی منطق وائل کو اب بالکل غلط نہیں لگی۔

"بگڑے ہوئے بچوں کو سدھارنا مجھے اچھے سے آتا ہے۔" اس نے مراد کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے سختی سے کہا۔ پھر واپس بزرگ آدمی کی طرف متوجہ ہوئی۔ "آپ بس مجھ سے وعدہ کریں کہ آج کے بعد مراد پہ ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔" امیرہ نے پُرامید نگاہوں سے بھوڑے شخص کی آنکھوں میں دیکھا۔

"نہیں اٹھاؤں گا۔" اس نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔

"اب آپ گھر جائیں۔" امیرہ نے سہارا دے کے اسے اٹھایا۔

لوگ جس خاموشی سے تماشا دیکھ رہے تھے اسی خاموشی سے رخصت ہونے لگے۔ بھوڑا آدمی بھی جب چلا گیا تو اس کا رُخ معصومیت کے علمدار، محترم مراد کی طرف ہوا۔

"تم کل مجھ سے آکر ملو۔" اس کا لہجہ اب برہمی اور مایوسی کے ملے جلے تاثرات لیے ہوئے تھا۔

"کہاں امیرہ آپی؟ مدرسے میں تو چھٹیاں چل رہی ہیں۔" اس نے سر اٹھا کے معصومیت سے پوچھا۔ البتہ نظریں ہنوز جھکی تھیں۔

"تم قلب میں رہتے ہو، نا؟"

اس کا سر اثبات میں ہلا۔

"وہاں غزال نامی ایک قہوہ خانہ ہے۔ وہیں آنا۔ ٹھیک تین بجے۔" امیرہ نے تین انگلیاں سامنے کیں۔

مراد بھی جب وہاں سے بھاگ گیا تو وہ اس کی طرف آئی۔

www.novelsclubb.com

"امید کرتی ہوں اس واقعے کے بعد تم امن نام کی چیز سے واقف ہوئے ہو گے۔" اٹھی ہوئی گردن اور بااعتماد آنکھوں سے کہہ کے، وہ اپنی رہگزر پہ آگے بڑھ گئی۔

یہ ان دونوں کے مابین ہونے والی پہلی براہ راست ملاقات تھی۔ آج سے پہلے وائل نے محض اسے دیکھا تھا، سنا تھا، یا سنایا تھا۔ لیکن اس ملاقات میں تینوں فعل موجود تھے اور حتمی جملہ وہ بولے یہ وائل بِن آدم کو گوارا نہیں تھا۔

"یہ شہر کیا تمہارے باپ کا ہے جو یہاں امن چاہتی ہو؟" اس نے پیچھے سے للکارا۔

وہ پلٹی۔ سنہری آنکھوں میں سرخ لکیریں ابھریں۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ کیوں خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑے ہو؟ چہرے پہ ڈھیروں بیزاری لیے اس نے وائل کو سخت نگاہوں سے دیکھا۔ "میری ہر بات پر طنز کیوں کرتے ہو؟"

اسے سمجھ نہیں آیا وہ اس کے اس قدر براہ راست سوالوں کے کیا جواب دے۔

سوال بھی وہ جن کے جوابوں سے وہ خود بھی لاعلم تھا۔اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ حریم کی یہ دوست اسے قطعاً پسند نہیں تھی۔اس کی موجودگی میں اسے کوفت محسوس ہوتی تھی۔اس لڑکی کی محض ایک جھلک دیکھ کے اسے غصہ آنے لگتا تھا۔ جسم کے تمام اعصاب تن جاتے تھے۔دل اتنے زوروں سے دھڑکتا تھا کہ لگتا تھا اپنی ہی دھڑکن کی بازگشت سے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔

وہ اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔وائل کی خاموشی پہ اس کی آنکھوں میں مزید سختی اتری تھی۔

اس کی گردن میں گلٹی سی ابھر کے ڈوبی۔"آئندہ میرے مسئلوں میں اپنی ٹانگ مت اڑانا۔"تنبیہ سے بھرپور، سپاٹ لہجے میں کہتا فوراً وہاں سے نکل لیا۔

اسے خدشہ تھا کہ وہ مزید ایک اور لمحہ بھی وہاں رکتا تو سینے میں تیزی سے دھڑکتا دل واقعی پھٹ جاتا۔

امیرہ نے اسے کینہ توز نظروں سے جاتے ہوئے دیکھا تھا، مگر بولی کچھ نہیں تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قلبلار میں موجود سیکڑوں مسجدوں میں سے چند ایک میں عصر کی اذان گونجنے لگی تو سورج کا رُخ اُفق کی طرف ہو گیا۔ فیض آزاد منزل کے برآمدے میں وائل کے کمرے کے باہر ایک ستون سے ٹیک لگائے اکڑ کے کھڑا تھا۔ وہ صبح سے اس کا انتظار کر رہا تھا لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا۔

"فیض کچھ تو بولو یار؟" سامنے کی دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑے حرم کی شرمندہ سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ صبح امیرہ کے جانے کے بعد اس نے حرم سے صرف ایک سوال پوچھا تھا۔

"کیا تمہیں سب معلوم تھا؟"

وہ آگے سے خاموش رہا تھا۔

تب سے وہ مسلسل اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ اور فیض نے اسے نظر انداز کیا تھا۔

"چاہے مجھ پہ غصہ کر لو لیکن کچھ بولو تو صحیح یار؟" حرم ایک مرتبہ پھر بے چینی

www.novelsclubb.com

سے گویا ہوا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔اس کی نظریں سنگ مرمر کے فرش پہ جمی تھیں۔ ذہن کے پردے پہ بار بار ایک ہی منظر اجاگر ہو رہا تھا۔

(وہ دونوں اس پہاڑ پہ برگد کے درخت کے پاس موجود تھے جب وائل اس کے قریب آتے ہوئے بولا تھا۔

"اگر تم میرے لیے کام کرو تو میں تمہیں حفاظت فراہم کر سکتا ہوں۔ پھر تمہیں قلبلار چھوڑ کے جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

وہ بے یقینی سے نفی میں گردن ہلاتا اس سے دور ہٹا تھا۔

"تم.... تم دور رہو مجھ سے۔" اس پہ یکدم اضطرابی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ اسے تنہائی میں اس خطرناک مجرم کے ساتھ ہونے پہ خوف محسوس ہوا تھا۔اس نے سمجھا تھا وائل بِن آدم کوئی ادھیڑ عمر آدمی ہو گا مگر وہ تو اس کا ہم عمر تھا۔بلکہ شاید اس سے بھی ایک دو سال چھوٹا تھا۔

"مجھے تمہاری کسی پیشکش کی ضرورت نہیں ہے۔" متذبذب انداز میں کہتا وہ پہاڑی سے نیچے جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔

"تمہیں نہیں ہے لیکن تمہارے اسلام صاحب کو تو ہے۔" اس کی للکار پہ فیض کے قدم زنجیر ہوئے۔

اس نے پلٹ کر پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ "کیا مطلب؟"

"ایک مجرم کو بھگانے کے جرم میں انہیں گرفتار کر لیا گیا ہے۔" وائل نے سر تا پیر اسے استہزائیہ نظروں سے دیکھا۔ "ضمانت نہیں ملے گی کیونکہ ایک پورے مجمعے کی موجودگی میں انہوں نے...."

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" اسے اپنے الفاظ کھوکھلے لگے تھے۔ کہیں نہ کہیں اسے اس کی باتیں سچ لگ رہی تھیں۔

"یقین نہیں آتا تو خود جا کے دیکھ لو۔" اس نے بے پرواہی سے شانے اچکائے۔

فیض پہاڑی کی ڈھلان کی طرف دوڑا تھا۔ چہرہ چھپا کے بھاگتا ہوا وہ اسلام صاحب کی دکان کے باہر پہنچا تو حیران ہوا۔ ان کی دکان بند تھی۔ عموماً وہ مغرب

سے کچھ وقت پہلے دکان بند کرتے تھے۔

"یہ اسلام صاحب کدھر گئے؟"اس نے ایک راہگیر کو روک کے پوچھا۔

"انہیں تھوڑی دیر پہلے شرطے سپاہی گرفتار کر کے لے گئے ہیں۔"

فیض کا حلق سوکھنے لگا۔وہ لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا وہاں سے بھاگ آیا۔

ایک سنسان سی گلی میں پہنچا تو وائل اسے دوبارہ نظر آیا۔وہ دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالے دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے تھا۔فیض اس کے قریب گیا۔

"انہوں نے تمہاری مدد کی اور بدلے میں.... چچ"اس نے افسوس سے گردن دائیں بائیں ہلائی۔

فیض بھی اس کے ساتھ جا کے دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا اور آنکھیں موند لیں۔وہ احسان فراموش نہیں تھا۔وہ اسلام صاحب کو ہر قیمت پہ جیل سے نکالنا چاہتا تھا۔لیکن کیسے؟

"تمہارے پاس دو راستے ہیں فیض بِن غفار۔یا تو خود کو سپاہیوں کے حوالے کر دو ۔یا پھر مجھ سے کچھ سالوں کا معاہدہ کرو اور بدلے میں، میں تمہارے محسن کی رہائی

کروادوں گا۔"اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔"میں تم پر لگے الزامات بھی گروادوں گا۔پھر تم جب تک چاہو قلبلار میں رہ سکو گے۔"

"کیسے؟"اس نے آنکھیں کھول کے وائل کی طرف دیکھا۔

"وہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔"وہ سامنے خلا میں دیکھ رہا تھا۔

اتنا تو وہ جانتا تھا کہ وائل بِن آدم کے لیے کوئی کام مشکل نہیں تھا۔اگر وہ کہہ رہا تھا کہ وہ ان کی رہائی کروادے گا تو وہ ان کی رہائی کروادے گا۔

"مجھے تمہارے لیے کیا کرنا ہو گا؟"اس نے استفسار کیا۔

"زیادہ کچھ نہیں۔صرف میرے بنائے گئے منصوبوں پہ توثیقی کی مہر لگانی ہو گی۔"

www.novelsclubb.com

"یعنی اپنی مستقبل پرکھنے کی صلاحیت کے ذریعے تمہارے چوری ڈکیتی کے منصوبوں میں ضروری تبدیلی کر کے ان کی کامیابی کا امکان بڑھانا ہو گا؟"اس نے سمجھنے والے انداز میں سر کو جنبش دی۔

وائل کا سر اثبات میں ہلا۔

پھر اس کی طرف مڑ کے تیز لہجے میں کہنا شروع کیا۔"اور یہ ہر گز مت سمجھنا کہ تم ایسا نہیں کرو گے تو میرا کاروبار نہیں چلے گا۔مجھے اپنے منصوبے کامیاب بنانے کے لیے آج تک کسی توثیق کی ضرورت نہیں پڑی۔میں تمہیں اپنے گروہ میں اس لیے شامل کر رہا ہوں کیونکہ تمہیں میری ضرورت ہے۔نہ کہ مجھے تمہاری۔"

وہ واقعی بہت چالاک تھا۔اپنا مطلب بھی نکلوا رہا تھا اور فیض پہ احسان بھی جتا رہا تھا۔اس کی مجبوری نہیں ہوتی تو وہ کبھی وائل بِن آدم کے گروہ میں شمولیت اختیار نہیں کرتا۔)

"تم دونوں یہاں کیوں کھڑے ہو؟"اس عفریت کی بھاری آواز فیض کو حال میں واپس لے کے آئی۔

اس نے سر اٹھا کے دیکھا تو وہ ان دونوں کو ہی متلاشی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

کوٹ اتار کے بازو پہ گرایا ہوا تھا۔

حرم فوراً سیدھا ہو کے کھڑا ہوا۔

"مجھے بات کرنی ہے تم سے۔"فیض کا لہجہ ترش تھا۔

"بولو۔"وہ بغور اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔

فیض نے بہت سارا تھوک نگلا۔"میں قلبلار چھوڑ کے جانا چاہتا ہوں۔"

"میری طرف سے انکار ہے۔"وہ لحظے کا بھی توقف کیا بغیر بولا تھا۔

"میں پوچھ نہیں رہا....بتا رہا ہوں۔"اس نے ہمت مجتمع کر کے اپنے لفظوں پہ زور دے کے کہا۔

وائل کی آنکھوں میں ناگواری نمایاں ہوئی۔"پھر بھی تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میرے ساتھ تین سال کا معاہدہ کیا ہے۔اس کی مدت ختم ہونے سے پہلے تم کہیں نہیں جا سکتے۔جب تک کہ میں اجازت نہ دوں۔"تحکم سے کہتا وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

"مجھے سب پتہ چل گیا ہے۔"وہ پیچھے سے اونچی آواز میں بولا تو اس کا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پہ ہی رک گیا۔

اس نے پلٹ کر اچنبھے سے فیض کو دیکھا۔

"کیسے تم سب نے مل کر مجھے بیوقوف بنایا۔" وہ سانس تلے دباسا ہنسا۔

وائل کے ابرو استعجاب سے اٹھے۔

"کتنی چالاکی سے مجھے جال میں پھنسا کے اپنے گروہ میں شامل کیا۔اسلام صاحب کو خود گرفتار کروا کے خود ہی رہا کروایا۔" وہ تیزی سے بول رہا تھا۔

وائل کے چہرے سے اطمینان محو ہوا۔

"تم نے سوچا ہو گا مجھے کبھی پتہ نہیں چلے گا۔ لیکن دیکھ لو.... سچ آخر سامنے آ ہی گیا۔" فیض نے اسے تنفر سے دیکھتے ہوئے سر جھٹکا۔

"کس نے بتایا اسے؟" اس کی گردن حرم کی طرف پھری۔ لہجہ درشت تھا۔

"وہ...." وہ ہکلایا۔

www.novelsclubb.com

"حرم کس نے بتایا؟" اس کی آواز مزید اونچی اور سخت ہوئی۔ بازو پہ لٹکتا کوٹ اس نے فرش پہ پھینک دیا۔

"ارادتاً کسی نے نہیں بتایا...."

"میں نے اس کا نام پوچھا ہے حرم بِن ہشام۔ یہ نہیں کہا کہ میرے سامنے

کھڑے ہو کے تم اس کی وکالت کرو۔" وہ چلاتا ہوا اس کے قریب گیا اور اسے گریبان سے پکڑا۔

حرم کے گلے میں گلٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔ وہ یقیناً امیرہ کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔

نچلی منزل پہ بنے مرکزی ہال کا دروازہ کھلا اور سب بازیگر ایک ایک کر کے باہر نکلے۔ حریم سب سے آگے تھی۔

اس نے گڑبڑا کے فیض کی طرف دیکھا۔

"اب کیا ہوا ہے؟" لب آواز کے بغیر ہلے تھے۔

فیض نے ایک گہرا سانس باہر نکالا۔ اور وائل سے مخاطب ہوا۔

"وائل بِن آدم.... تم پر اور تمہارے اس پیشے پہ لعنت بھیج کے میں جا رہا ہوں۔ جو کرنا ہے کر لو۔" چبا چبا کے کہتا وہ پلٹنے کے لیے مڑا۔

لیکن قلبلار کے عفریت نے اسے پلٹنے کی مہلت نہیں دی۔ ایک لمحے میں حرم کا گریبان چھوڑ کے وہ کسی طوفان کی طرح اس پہ جھپٹا تھا۔ اس کی گردن دبوچے

آندھی کی رفتار سے اسے برآمدے کی دوسری دیوار سے پٹخا۔اتنے زوردار انداز میں دیوار سے ٹکرانے کے باعث اس کی ریڑھ کی ہڈی میں درد کی شدید لہر اٹھی تھی۔

فیض کو سانس نہیں آرہا تھا۔وہ اپنے دونوں اس کی مضبوط کلائی تک لے جا کے اس کی گرفت سے آزاد ہونے کی جی توڑ کوشش کرنے لگا۔لیکن وہ انسان کا نہیں، کسی حیوان کا ہاتھ تھا۔اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بھی لمحے اس کی گردن کی ہڈیاں ٹوٹ کے چکنا چور ہو جائیں گی۔اس لمحے فیض کو پہلی مرتبہ وائل بِن آدم کے غیر معمولی ہونے کا شبہ ہوا تھا۔کسی انسان میں اتنی طاقت نہیں ہو سکتی کہ وہ....

"آئندہ مجھے دھمکانا تو دور کی بات،ایسا کرنے کے بارے میں سوچنا بھی مت۔"

اس کی آنکھوں میں غضب اترا تھا۔وہ مکمل طور پہ اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہا تھا۔یا شاید فیض کے لیے اس کا یہ روپ نیا تھا۔کیونکہ پیچھے کھڑے بازیگر خوف زدہ تو نظر آتے تھے۔لیکن ان کے چہروں پہ حیرانی کا کوئی عنصر موجود نہیں تھا۔

"اپنی تین سال کی مدت پوری کرو۔اس کے بعد میری بلا سے بھلے ہی جہنم رسید

ہو جانا۔ ورنہ انسانی جان لینے میں، میں ماہر ہوں، فیض بِن غفار۔" اس نے زہر آلود آواز میں کہتے ہوئے ایک جھٹکے میں اسے فرش پہ پٹخا تھا۔

فیض کھانستا ہوا سانس لینے کی کوشش کرنے لگا۔ حریم دوڑ کے اس کی طرف آئی تھی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کی کمر پہ تیزی سے ہاتھ پھیرتے ہوئے سانس لینے میں مدد دی۔

"اسے یہ سب کس نے بتایا تھا؟" وہ بازیگروں کی طرف رُخ کیے ایک مرتبہ پھر غرایا تھا۔

وہ سب بے اختیار پیچھے ہٹے تھے۔

"حریم کی دوست نے...." فاطمہ نامی ایک لڑکی کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

حریم نے دانت کچکچا کے اسے غصے سے دیکھا۔

"نہیں۔" سر نفی میں ہلاتے اس نے اسے بغیر آواز کے تنبیہ کی۔

مگر فاطمہ اسے نہیں سن رہی تھی۔ وہ اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔ "وہ اسلام صاحب کے گھر رہتی ہے۔ میں نے تو حریم سے کہا بھی تھا کہ اس سے دوستی نہ

کرے لیکن...."

وائل نے رک کے پوری بات سننے کی زحمت نہیں کی۔زمین پہ گرااپنا کوٹ اٹھایااور غصے کے عالم میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"جہنم میں جاؤ تم فاطمہ۔"وہ جھنجلاہٹ زدہ آواز میں کہتی اٹھی۔"حرم اسے پانی لا کر دو۔اور کوئی علینہ کو بلا کے لائے۔"زمین پہ بیٹھے فیض کی طرف اشارہ کیا اور خود بھاگتی ہوئی،وائل کے پیچھے گیٹ کھول کے باہر نکل گئی۔

فیض کا سانس ابھی تک نہیں مل پایا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

امیرہ اپنے کمرے میں عصر کی نماز ادا کرنے کے بعد جائے نماز پہ بیٹھی دعا مانگ رہی تھی۔اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر رہی تھی۔اس نے دونوں ہاتھ چہرے پہ پھیرے کے جائے نماز کے کونے میں پڑی تسبیح اٹھائی اور گھٹنوں کے گرد بازو حائل کیے وہیں بیٹھے بیٹھے ذکر کرنے لگی۔

عموماً وہ مسجد میں باجماعت نماز ادا کیا کرتی تھی۔لیکن آج اس کے سر میں درد تھا

تواس نے گھر پہ نماز پڑھ لی تھی۔

دفعتاً دروازے پہ دستک ہوئی تواس نے سر اٹھایا۔انگلیوں کی پوروں سے آنکھیں پونچھیں اور جائے نماز سے اٹھ گئی۔اسلام صاحب کی بیوی اور بیٹی ابھی تھوڑی دیر قبل ہی کسی بیمار کی تیمارداری کے لیے باہر گئے تھے۔یقیناً اسلام صاحب مسجد سے واپس آئے ہوئے ہوں گے۔اس نے جائے نماز تہہ کر کے رکھا اور باہر صحن میں نکل آئی۔

گیٹ میں لگے چھوٹے دروازے کی کنڈی پچھلے دو دنوں سے جام تھی جس کی وجہ سے اس نے بڑی کنڈی کو کھول کے دونوں دروازے الگ کیے۔

وہ جو اسلام صاحب کی توقع کر رہی تھی اگلے لمحے اسے دیکھ کر تعجب سے ٹھٹکی۔

اس نے ہڑبڑا کے دروازوں کو وہیں سے بند کرنا چاہا مگر وہ انہیں انتہائی جارحانہ انداز میں انہیں پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے زبردستی اندر گھسا۔وہ توازن برقرار نہ رکھ پانے کے باعث چار قدم پیچھے کی طرف لڑکھڑائی تھی۔

"کیا بدتمیزی...."

"خود کو کون سی ریاست کی شہزادی سمجھ رکھا ہے جو میرے ہر معاملے میں ٹانگ اڑانے آجاتی ہو؟" وہ برق رفتاری سے اس کے قریب آتے ہوئے غضبناک انداز میں غرایا تھا۔

قہر برساتی سرمئی آنکھوں میں بجلی کڑکنے جیسی گرج چمک تھی۔ ماتھے پہ ڈھیر ساری سلوٹیں اور دونوں کانوں کی لو گہری سرخ۔ جبڑے اور کنپٹی کی رگیں ایسے نمایاں تھی جیسے ابھی کے ابھی پھٹ جائیں گی۔ وہ شدید اشتعال کے عالم میں لگ رہا تھا۔

"مجھ سے دور رہ کر بات کرو۔" وہ چار قدم مزید پیچھے ہٹتے ہوئے اضطرابی کیفیت میں بولی تھی۔

www.novelsclubb.com

اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے میں سے ایک تیز دھار خنجر نکالا تو امیرہ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

خنجر کی دھار پہ انگلی پھیرتے ہوئے ایک قدم امیرہ کی طرف بڑھایا۔

"میں کہہ رہی ہوں مجھ سے دور رہو۔" انگشت شہادت اٹھا کے لرزتی ہوئی

آواز میں اسے تنبیہ کی۔

مگر وہ قہر آلود طوفانی آنکھیں اس پہ جمائے آگے بڑھتا گیا۔اور وہ الٹے قدموں بے اختیار پیچھے ہٹتی چلی گئی۔اس کا دل کانپ رہا تھا۔اسے اس سے خوف آرہا تھا۔ اس کی موجودگی میں بے پناہ وحشت محسوس ہو رہی تھی۔

پیچھے دیوار آگئی تو امیرہ کے قدم تھم گئے۔وہ اس سے بچ کے وہاں سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی تو اس نے کلائی پکڑ کے اسے واپس دیوار سے لگایا۔

"میرا ہاتھ چھوڑو۔"امیرہ نے اسے نفرت سے دیکھا تھا۔

اس نے ایک جھٹکے میں اس کی کلائی چھوڑ دی۔

"میں...."لحظے بھر کے لیے اس کا سانس رکا۔"....چلا کے سب کو بلالوں گی۔"ہاتھ اوپر اٹھا کے اسے خود سے دور کرنا چاہا تو جواباً اس نے اس کے ہاتھ میں لپٹی سفید موتیوں والی تسبیح کو اتنے زور سے کھینچا کے اس کا دھاگا ٹوٹ گیا۔سو کے سو، سفید دانے فرش پہ بکھر گئے۔

"چلاؤ۔میں بھی دیکھوں کتنا دم ہے تمہاری آواز میں۔"استہزائیہ لہجے میں کہتے

اس نے بائیاں ہاتھ امیرہ کے سر کے بائیں جانب رکھا اور دائیں ہاتھ میں موجود خنجر اس کی ٹھوڑی تلے۔

امیرہ کو لگا اس کا دل کسی بھی لمحے بند ہو جائے گا۔

اس نے بہت سارا تھوک نگل کے لب کھولے۔ مگر چلانا تو دور، ایک لفظ بھی باہر نہ نکلا۔ اس کے حلق سے جیسے آواز ہی چھین لی گئی۔ مارے خوف کے اس کا دل زوروں سے دھڑک رہا تھا۔

"امیرہ بنتِ آدم...." اس کا نام ایسے لیا جیسے زہر ہو۔ "مجھ سے دشمنی مول لے کے تم نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔ کیونکہ میں اب تمہیں سکون سے رہنے نہیں دوں گا۔ اس شہر میں تمہارا جینا محال نہ کر دیا نا تو میرا نام بھی وائل ابنِ آدم نہیں۔" وہ کانٹے دار آواز میں کہے گئے اپنے ایک ایک لفظ کے ساتھ اس کی ٹھوڑی تلے رکھے خنجر کا دباؤ بڑھا رہا تھا۔ تیز دھار اس کے دوپٹے کے کپڑے کو چیر کہ جلد تک پہنچنے ہی والی تھی کہ....

"پیچھے ہٹو۔" کسی نے اسے کندھے سے پکڑ کے امیرہ سے دور دھکیلا تو اس کے

ہاتھ سے خنجر گر گیا۔

وہ حریم تھی۔ وہ دوبارہ اس پہ جھپٹا تو وہ کسی ڈھال کی طرح ہاتھ پھیلا کے اس کے آگے کھڑی ہو گئی۔

"تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے وائل؟" وہ انتہائی برہم آواز میں چلائی تھی۔

اس نے منہ اور ٹھوڑی پہ ہاتھ پھیرا۔ پھر جھک کے زمین پہ گرا خنجر اٹھایا۔ "تم سے تو میں گھر جا کے بات کروں گا۔ فی الحال اس سے نمٹ لوں۔"

غضب ڈھاتی نظریں امیرہ پہ گاڑے زہریلی آواز میں کہنا شروع کیا۔ "امیرہ بنتِ آدم، آج سے اپنے برے دن گننا شروع کر دینا۔ کیونکہ میں تمہیں رلاؤں گا۔ اور.... میں.... تمہیں.... خون کے آنسوں رلاؤں گا۔"

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔" حریم نے خفگی سے اسے ٹوکا۔ لیکن اس کے لیے تو وہ وہاں موجود ہی نہیں تھی۔

وہ اپنے اندر کا زہر صرف امیرہ پہ اگل رہا تھا۔

"اور میں صرف کھوکھلی دھمکیاں نہیں دے رہا۔ تمہیں تمہارے مستقبل سے

آگاہ کر رہا ہوں۔" درشت لہجے میں کہہ کے وہ پلٹا اور اپنے پیچھے کھٹاک سے گیٹ بند کر کے وہاں سے چلا گیا۔

حریم اس کی طرف مڑی۔

"امیرہ تم ٹھیک ہو؟" اس نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔

اس نے گہرے سانس لے کے ایک نظر حریم کو دیکھا۔ پھر فرش پہ بکھرے، ٹوٹی ہوئی تسبیح کے سفید موتیوں کو۔

اسے زندگی میں کبھی کسی سے اتنی نفرت محسوس نہیں ہوئی تھی، جتنی اس وقت وائل بِن آدم سے ہو رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

www.novelsclubb.com

وہ ایک دفتری کمرہ تھا۔ اچانک کوئی دروازے کو لات مار کے کسی زلزلے کی طرح اندر گھسا تھا۔

میز کے اس پار بیٹھے زبیر کے اطمینان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ جانتا تھا داخلے کا ایسا ہنگامی انداز صرف ایک ہی شخص کا ہو سکتا ہے۔ اور وہ شخص وائل بِن

آدم تھا۔

"امیرہ بنتِ آدم۔" اس نے تنفر سے یہ نام لیتے ہوئے میز پہ اپنی ہتھیلی پٹخی۔ جب واپس اٹھائی تو وہاں ایک سفید رنگ کی چٹ موجود تھی جس پہ یہی نام درج تھا۔

"مجھے اس لڑکی کے بارے میں الف سے لے کر یے تک ساری معلومات چاہیے۔ کب پیدا ہوئی۔ کہاں پیدا ہوئی۔ کس کے ہاں پیدا ہوئی۔ کہاں پرورش پائی۔ ماں باپ کون ہیں۔ بہن بھائی کون ہیں۔ کہاں سے تعلیم حاصل کی۔ کن کن صلاحیتوں کی حامل ہے۔ اور کیا کیا کمزوریاں ہیں۔ سب کچھ۔" رٹے رٹائے سبق کی طرح روانی سے کہتا وہ پلٹ گیا۔ جس ہنگامی انداز میں اندر داخل ہوا تھا اسی ہنگامی انداز میں باہر بھی نکل گیا۔

اس نے اپنا کام کہہ دیا۔ زبیر نے اسے سن لیا۔ یعنی اس کا کام ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

(موجودہ دن۔)

نہران۔

صبح کا سورج مکمل طور نہران پر طلوع ہو چکا تھا۔ دور سے دیکھنے پر سلطان خیام کے محل کے سنہری گنبد دھوپ میں چمکتے سونے کی مانند نظر آ رہے تھے۔ وسیع و عریض، کھلی کھڑکیوں کے باعث محل کا کونا کونا سورج کی روشنی میں نہایا تھا۔ بے شمار کمروں میں سے ایک طویل کمرے میں آؤ تو دیواروں کے ساتھ مخالف سمتوں میں لاتعداد پلنگ بچھے تھے۔ انہیں میں سے ایک پلنگ پر حاتم بیٹھا اپنی شرٹ کے بٹن بند کر رہا تھا۔ تیمور اس کے سامنے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ یہ محل کا طبیب خانہ تھا جہاں ایک مردانہ طبیب ابھی کچھ لمحے قبل ہی حاتم کے زخم کی پٹی کر کے گیا تھا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا۔ طبیب نے بس کچھ احتیاطی تدابیر بتائیں تھی۔

"دھیان کہاں تھا تمہارا؟ اگر گہری چوٹ لگ جاتی تو؟" تیمور کے تاثرات تھوڑے بگڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ وہ اس کا بڑا بھائی تھا۔ ضرورت سے زیادہ اس کی پرواہ کرتا تھا۔

حاتم نے محض کندھے اچکا دیئے۔ وہ اب شاہانہ طرز کی کڑھائی سے آراستہ

جیکٹ میں بازو ڈال رہا تھا۔

"میں مدد کرا دیتا ہوں۔" تیمور آگے بڑھا اور اسے جیکٹ پہنانے کے بعد واپس دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا ہو گیا۔ دونوں ہاتھ اس نے سینے پہ باندھ لیے۔

کچھ لمحے خاموشی سے کٹے۔

"تمہاری لیلیٰ کب واپس آ رہی ہے؟" اس نے سوال کرتے ہوئے حاتم کے تاثرات غور سے دیکھے۔

ایک لمحے میں اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

"عید سے کچھ دن پہلے۔" مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

لیلیٰ بنتِ شہاب کے نام پر اس کے چہرے پہ ایسے ہی مسکراہٹ بکھر جاتی تھی۔

"تم بتا دو گے اسے کہ نہران کے امیر (شہزادے) ہو؟"

"ہاں۔ میں تو اسے جانے سے پہلے ہی بتا دینا چاہتا تھا۔" حاتم نے افسوس سے آنکھیں میچیں۔ "مگر پھر تمہاری سختی سے کی گئی تاکید یاد آئی تھی کہ ابوالحسن کی گرفتاری تک کسی بشر کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں۔"

"اچھا کیا تم نے اسے نہ بتا کر۔ ویسے بھی میں ابھی تک آمادہ نہیں ہوں کہ وہ لڑکی نہران کے ساتھ مخلص ہے۔"

تنے اعصاب کے ساتھ کہے گئے تیمور کے اس جملے پر حاتم کے چہرے کے تاثرات بگڑے۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔"

"کیوں؟ کیا اس نے ہمارے شہر میں چوریاں نہیں کیں؟" تیمور نے جتا کے پوچھا۔

"کیں ہیں۔ مگر اس کے پیچھے اس کی نیت یتیم خانے کے بچوں کی مدد کرنے کی تھی۔ اور اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہوتا ہے، تیمور بن خیام۔" جواباً حاتم بھی جتا کے بولا۔

"جو بھی ہو۔ غلط کام کی کوئی صفائی نہیں ہوتی۔ جو غلط ہے، وہ غلط ہے۔"

حاتم نے اس کے بعد کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر وہ دونوں اس گفتگو میں پڑ جاتے تو پھر سارا دن اسی پر بحس کرتے رہتے۔ وہ دونوں تھے تو بھائی مگر دونوں کی شخصیت

ایک دوسرے سے میلوں دور تھی۔

تیمور بہت شکی مزاج۔ حاتم آسانی سے اعتبار کر لینے والا۔ تیمور پہلی غلطی کو آخری غلطی قرار دے کر سزا سنا دینے والا۔ حاتم دوسرا موقع دینے پر یقین رکھنے والا۔ تیمور ظاہری حقائق پر مبنی فیصلے کرنے والا۔ حاتم تصویر کا غیر نمایاں پہلو دیکھنے والا۔ تیمور کوئی نخرہ دکھائے بغیر ہر طرح کے حالات میں صبر شکر کرنے والا۔ اور حاتم بلا کا نخریلا۔ تیمور باپ کا پسندیدہ بیٹا تو حاتم ماں کا لاڈلہ۔ کوئی ایک بھی مماثلت ان دونوں بھائیوں میں پائی نہیں جاتی تھی۔

"ویسے منطقی طور پر تم نے اس سے جھوٹ نہیں بولا۔"

تیمور کی بات سن کر اس کے چہرے پہ ناسمجھی کے تاثرات نمایاں ہوئے۔

"مطلب؟"

"اگر تم حاتم ہو تو قیس بھی تو تم ہی ہو۔ میری ایک معمولی سی ضد کی وجہ سے تمہارے دس سال ضائع ہو گئے۔ دس سال تم نے قیس بِن قاسم بن کے گزار دیئے۔ جبکہ تمہیں حاتم بن خیام ہونا چاہیے تھا۔" وہ ایک پچھتاووں میں گھرے

ہوئے مرد کی آواز تھی۔

"بھول جاؤ وہ سب تیمور۔ میں نے تمہیں کبھی قصوروار نہیں ٹھہرایا۔ تم بھی ایسا مت کیا کرو۔" وہ اپنے بڑے بھائی کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے نرمی سے بولا۔

"ویسے بھی پہچان بدل جانے سے شخصیت نہیں بدلتی۔ وہ حادثہ نہ ہوا ہوتا تب بھی میں ایسا ہی ہوتا جیسا آج ہوں۔"

وہ اتنے برسوں سے اپنے بھائی کا احساسِ ندامت کم کرنے کی کوشش کرتا آیا تھا۔ آج بھی وہی کر رہا تھا۔

"مگر شاید اس ملک کے لوگوں کی نظر میں تم قابلِ نفرت نہیں بنتے۔" وہ خلا میں کسی غیر مرعی نقطے پہ نظریں جمائے بولا۔ "سچ کہوں تو مجھے ترس آتا ہے اپنے لوگوں کی جہالت پر۔ کوئی یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ اس بیماری کی صورت جو عذاب ان پر آیا ہے، یہ ان کے اپنے گناہوں کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ الٹا سب تمہیں الزام دیتے ہیں۔ اس چیز کا ذمہ دار تمہیں ٹھہراتے ہیں، صرف اس لیے کہ جس سال تم واپس آئے، اسی سال یہ بیماری بھی نازل ہوئی نہران پر۔" اس نے توقف

کیا۔ نظریں اٹھا کے حاتم کو دیکھا۔ وہ توجہ سے اسے سن رہا تھا۔

"اب جب سے ایسی گفتگو سے گریز نہ کرنے کی صورت میں سزا کا قانون متعارف کرایا گیا ہے تو انہوں نے تمہاری حب الوطنی پہ باتیں کرنا شروع کر دی ہیں۔" تیمور نے سر جھٹکا۔

حاتم مبہم سا مسکرایا۔

"ولی کہتا تھا، اللہ نے لوگوں کو دماغ دیئے ہیں سوچنے کے لیے۔ اور زبان دی ہے بولنے کے لیے۔ وہ جو چاہیں سوچیں۔ جو چاہیں کہیں۔ مجھے ان کی پرواہ نہیں ہے۔" اپنے اس دل عزیز کے ذکر پر حاتم کی آواز میں زخمی سا تاثر نمایاں ہوا۔ "کاش میں بھی ایسا کہہ پاتا کہ لوگوں کی باتوں سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مگر مجھے فرق پڑتا ہے۔ اسی لیے تو میں اتنی کوشش کر رہا ہوں کہ میرے لوگ مجھے قبول کر لیں۔ میں نہیں چاہتا آنے والی نسلیں تاریخ کی کتابوں میں مجھے ایک مطرود شہزادے کے نام سے پہچانیں۔" وہ بول کے خاموش ہو گیا۔

تیمور نے بھی جواباً کچھ نہیں کہا۔

کچھ پل خاموشی چھائی رہی۔

"ولی سے یاد آیا۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں ابھی تک کوئی سراغ نہیں ملا؟" تیمور نے سنجیدگی سے پوچھا۔

حاتم نے نفی میں گردن ہلائی۔

"تمہیں لگتا ہے وہ زندہ ہو گا؟" تیمور نے تھوڑی کھجائی۔

وہ ہلکا سا ہنسا۔ "وہ اتنی آسانی سے مرنے والی چیز نہیں ہے۔"

"ایک وقت تھا جب اس کی تلاش کو ہی تم نے اپنی زندگی کا واحد مقصد بنا لیا تھا۔"

حاتم کے لبوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ پھیلی۔ "میں آج بھی اسے اتنی ہی لگن سے ڈھونڈ رہا ہوں جتنی لگن سے سات برس پہلے ڈھونڈنا شروع کیا تھا۔ میں نے ابھی تک اس پر ہار نہیں مانی۔ آج بھی میں نے حداد اور دوسرے ملکوں میں اپنے لوگ چھوڑ رکھے ہیں۔ دوا کا بخوبی بندوبست کر کے میں نے یہ معاملہ اللہ پہ چھوڑ دیا ہے۔ اگر میری قسمت میں اس کا ملنا ہوا تو وہ مجھے مل جائے گا۔"

"اور اگر وہ نہ ملا تو؟"

"تو میں سمجھوں گا کہ ہم دونوں کے راستے کبھی نہ ٹکرانے میں ہی مصلحت تھی۔"

تیمور نے سمجھنے والے انداز میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔

وہ دونوں مزید کچھ دیر دیگر فوجی اہم امور پر بات کرتے رہے۔اس کے بعد تیمور اسے آرام کی تلقین کر کے طبیب خانے سے باہر نکل گیا۔حاتم سفید پلنگ پر چت لیٹ گیا۔اس نے آنکھیں بند کیں تو آنکھوں کے پردے پر نو برس پہلے کا منظر لہرانے لگا۔

www.novelsclubb.com

(وہ ایک لوہے کا کارخانہ تھا۔اور وہاں کام کرنے والے سب مزدوروں کی عمریں دس سے لے کر اکیس برس کے درمیان تھیں۔سترہ سالہ حاتم بھی انہیں مزدوروں میں سے ایک تھا۔وہ وہاں قیس کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔

وہ لوہے کے ایک راڈ کو آگ کی بھٹی میں گرم کر رہا تھا جب پیچھے سے کسی نے آ

کراس کی گردن کے گرد اپنا بازو حائل کیا۔

"کیسے ہو میرے پیارے مجنوں؟" چہکتی ہوئی آواز اس کے کان میں گونجی۔

حاتم درد سے کراہا۔

نووارد فوراً بازو ہٹاتے ہوئے اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ حاتم جیسی خاکی وردی میں ملبوس بے پرواہ سا حلیہ لیے۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" فکر مندی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" حاتم دوبارہ اپنے کام کی طرف متوجہ ہوا۔

"جھوٹ مت بولو۔" وہ آگے بڑھا اور اس کی خاکی شرٹ گردن سے ہٹا کر دیکھی۔

www.novelsclubb.com

وہاں تازہ تازہ جلنے کا نشان تھا۔ جیسے کسی نے گرم لوہا اس کی گردن پہ رکھا ہو۔

پندرہ سالہ اس کے دوست کے تاثرات پتھر جیسے ہوئے۔ اس کی سخت نظریں حاتم کے گلے کے نشان سے ہوتی ہوئیں اس کی آنکھوں تک پہنچیں۔ "کس کی حرکت ہے یہ؟"

"چھوڑو ولی جانے دو۔"اس نے اپنی شرٹ درست کی۔

"ایسے ہی جانے دوں۔"اس کے تاثرات مزید بگڑے۔"تم مجھے بتاؤ یہ کس نے کیا ہے؟"

"چھوڑو یار۔خواہ مخواہ تماشا لگے گا۔"

"تو تم مجھے نہیں بتاؤ گے۔"اس نے گردن اوپر نیچے ہلاتے ہوئے چہرے پہ ہاتھ پھیرا۔

"عباس۔"وہ خود ہی زیرِ لب بڑبڑایا اور پھر آندھی طوفان کی طرح دائیں جانب بڑھ گیا۔

حاتم نے بے اختیار اپنا ماتھا چھوا۔اس کے بتائے بغیر بھی اس کے دوست کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کے ساتھ یہ کس نے کیا ہے۔اسے ہمیشہ ہی معلوم ہو جاتا تھا۔

حاتم اس کے پیچھے دوڑا۔

ولی نے بظاہر کام میں مصروف عباس کو کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف کیا اور پھر پوری قوت سے ایک مکا اس کے جبڑے پہ دھرا۔اس کا اوپر والا دوسرا دانت نکل

کر پرے جا گرا۔ پہلا دانت ولی نے دو مہینے قبل والی لڑائی میں توڑ دیا تھا۔اور دوسرا ٹوٹنے کے بعد اب اس کے دانتوں میں سامنے خلا آ گیا تھا۔اس تشویشناک صورتحال میں بھی حاتم کو اس کے دانتوں کی حالت دیکھ کر ہنسی آئی۔

ولی اس پہ دوبارہ جھپٹا تو حاتم آگے بڑھا اور اسے جھکڑ کے پیچھے کیا۔اس کے ہاتھ قابو میں ہو گئے تو اس نے دونوں ٹانگیں عباس کے سینے پہ دے ماریں۔وہ پیچھے جا کے گرا۔پھر اس نے حاتم کے پیٹ میں کہنی ماری۔حاتم کی گرفت اس پہ کمزور پڑی۔اگلے لمحے وہ اس کے شکنجے سے آزاد ہو کر زمین پہ پڑے عباس پر واپس جھپٹا۔

"تمہاری ہمت کیسے ہوئی کہ تم قیس کو جلاؤ؟"

وہ اس کے اوپر بیٹھ کر اس کے دونوں جبڑوں پر مکوں کی برسات کر رہا تھا۔لیکن عباس خون سے لت پت منہ کے ساتھ ڈھیٹوں کی طرح دانت نکالتا رہا۔حاتم کو اس کی ساری کارستانی سمجھ میں آ رہی تھی۔

اس عباس نے اسی لیے حاتم کی گردن جلائی تھی تاکہ ولی دیکھے اور پھر یہ تماشا لگے۔اور وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو بھی گیا تھا۔آس پاس تماشائیوں کا رش

لگنے لگا۔ کوئی کارخانے کے نگران کو اس کے دفتر سے بلا لایا تھا۔ اس نے ولی کو بازو سے پکڑ کر پاس پڑے لوہے کے میز پہ پٹخا۔ حاتم نے مٹھیاں بھینچ کے نگران کو تنفر سے دیکھا۔ جو اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کی باریک سی چھمک تھی جو بظاہر ہلکی نظر آتی تھی مگر اس کی ضرب بہت تکلیف دہ ہوا کرتی تھی۔

"کتنی مرتبہ منع کیا ہے کہ آئے دن لڑائی کر کے یہاں تماشا مت لگایا کرو۔" نگران غصے کے عالم میں چلایا۔

حاتم ولی کے قریب گیا اور اسے سہارا دے کر سیدھا کھڑا کرنے کی کوشش کی۔

"یہ سب قیس کا قصور ہے۔" ولی دبک کے اس سے دور ہٹا۔ "یہ لڑائی اس نے شروع کی تھی۔" اس نے حاتم کی طرف اشارہ کیا۔

حاتم نے جواباً اسے بے یقینی سے دیکھا۔

"نگران، یہ جھوٹ بول رہا ہے۔" وہ ہڑبڑاتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھا۔ "پہلے ولی نے عباس کو مارنا شروع کیا تھا۔ آپ چاہیں تو عباس سے پوچھ لیں۔"

"عباس سے پوچھنے کی کیا ضرورت...."

"خاموش۔" نگران کی آواز کارخانے میں گونجی تو وہ جو تیزی سے کہہ رہا تھا خاموش ہو گیا۔

"ہاں بھئی عباس۔ تم بتاؤ کے یہ تماشا کس نے شروع کیا تھا؟" وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

عباس نے پہلے ولی کو دیکھا جو اسے سلگتی نظروں سے گھور رہا تھا۔ پھر اس نے حاتم کو دیکھا۔

اس کی گردن میں گلٹی سی ابھر کے معدوم ہوئی۔ "میں اور قیس ساتھ کام کر رہے تھے اور غلطی سے لوہے کا راڈ اس کی گردن پر لگ گیا۔"

"اس نے جان بوجھ کر...." حاتم نے اس کی غلط بیانی پہ آواز اٹھانی چاہی۔

جواباً نگران نے انگشت شہادت منہ پہ رکھی تو وہ بے بسی سے دانت کچکچاتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

عباس نگران کا چہیتا مزدور تھا۔ وہ کارخانے میں ہونے والی ہر چھوٹی بڑی چیز کی

خبریں اسے دیا کرتا تھا۔اس لیے نگران کو اس کی غلطی کبھی نظر نہیں آتی تھی۔

"میں نے قیس سے معافی بھی مانگی مگر اس نے غصے میں آ کے مجھے مارنا شروع کر دیا۔اور پھر ولی نے بھی آ کر اس کا ساتھ دیا۔"عباس اتنی معصومیت سے بولا کہ حاتم کا دل چاہا اسے اٹھا کے جلتی آگ میں پٹخ ڈالے۔

"میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ غلطی قیس کی ہے۔"ولی نے دوبارہ حوالہ دیا تو حاتم نے اسے غصے سے گھورا۔

"ہوں۔"نگران نے سمجھ کے سر ہلایا۔"اب چونکہ غلطی قیس نے کی ہے تو سزا اس کے پیارے ولی کو ملے گی۔"

"نگران غلطی میری ہے تو سزا بھی مجھے ملنی چاہیے نا؟"حاتم نے جیسے التجا کی۔

"تم جانتے ہو یہ میرا اصول نہیں ہے۔اگلی مرتبہ کچھ کرنے سے پہلے یاد رکھنا کہ تمہاری غلطیوں کی سزا تمہارے دوست کو بھگتنی پڑتی ہے۔"وہ برہمی سے کہہ کے ولی کے قریب گیا۔

اس نے خود بخود ہی اپنا دائیاں ہاتھ آگے کیا۔نگران نے لکڑی کی پتلی چھڑی اس

کے ہاتھ پہ دس مرتبہ پوری قوت سے جھڑی۔ مگر مجال ہے جو اس کے منہ سے ایک سسکی بھی نکلی ہو۔ پھر اس نے اپنا بائیاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ دس مرتبہ دائیں ہاتھ پہ ضرب لگائی گئی۔ اس مرتبہ بھی وہ درد ضبط کر گیا۔

حاتم نے بے بسی سے اپنی نظریں پھیر لیں۔ ماروی کو پڑ رہی تھی مگر تکلیف اسے پہنچ رہی تھی۔

اس نے دیکھا عباس کے چہرے پہ مطمئن مسکراہٹ بکھری تھی۔ اس کی مٹھیاں مزید بھینچیں۔

اس عباس سے تو وہ اپنے طریقے سے نمٹے گا۔

"تمہیں سزا کے طور پر اگلے ایک ہفتے تک کھانا نہیں ملے گا۔ لال مرچوں کے شوربے پہ گزارا کرو گے۔ رات کو کھلے آسمان تلے بغیر رضائی کے سوؤ گے۔ اور کام بھی تم باقی سب سے دگنا کرو گے۔ سمجھے؟" نگران نے ولی کی کنپٹی پہ انگلی سے دستک دی۔

اس نے مودبانہ انداز میں سر ہلایا۔

حاتم کو اس پہ شدید غصہ آرہا تھا۔(کیا ضرورت تھی اسے خواہ مخواہ یہ تماشا کرنے کی؟)

"اور تم اگر اس کے پاس منڈلاتے نظر آئے یا کسی قسم کی مدد کرنے کی کوشش کی تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" نگران نے انگشت شہادت اٹھا کے حاتم کو تنبیہہ کی۔"چلو شاباش اب سب اپنے اپنے کام پہ لگ جاؤ۔"اس نے دونوں ہاتھوں سے تالی بجا کے سب کو برخاست کیا۔

ولی سمیت سب اپنے کام میں دوبارہ مصروف ہو گئے۔

سیاہ رات آسمان پہ چھا گئی تو حاتم اپنے بستر سے اٹھ کے چادر ہاتھوں میں اٹھائے محتاط قدموں باہر نکل آیا۔کمرے کا دروازہ اندرونی راہداری میں کھلتا تھا۔مگر حاتم کھڑکی کے راستے برآمدے میں آیا تھا۔وہ جانتا تھا اس کے کمرے میں موجود باقی پانچ لڑکے نگران کے آگے اس کی چغل خوری نہیں کریں گے۔

کھڑکی سے اترتے ساتھ ہی اسے ولی نظر آگیا۔وہ ایک ستون سے ٹیک لگائے، گھٹنوں کے گرد بازو حائل کیے اکٹھا ہو کے بیٹھا تھا۔وہ شاید کانپ بھی رہا تھا۔باہر

صحن میں ہلکی ہلکی برف گر رہی تھی۔

وہ اس کے قریب آیا۔

"تمہیں ٹھنڈ لگ رہی ہے؟"

ولی نے سر اٹھا کے اسے دیکھا۔ پھر کانپتے ہونٹوں سے بولا۔ "نہیں۔ آسمان سے جو شولے برس رہے ہیں ان کے باعث میرا گرمی سے برا حال ہے۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے شرٹ جھڑی جیسے اسے واقعی بہت پسینہ آیا ہوا ہو۔

حاتم نے اس کے طنز پہ تاسف سے سر ہلاتے ہوئے چادر اس کے کندھوں پہ گرائی۔ پھر اس کے ساتھ بیٹھا اور چادر اپنے اوپر بھی اوڑی۔

اس کی نظریں پاس پڑے مٹی کے پیالے تک گئیں۔ جس میں ابھی تک لال مرچوں کا پانی موجود تھا۔

"یہ اتنا لذیذ تھا کہ میں نے کل کے لیے بچا دیا ہے۔" اس نے ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے وضاحت کی۔

"بکومت۔" حاتم جھنجھلایا۔ "کیا ضرورت تھی تمہیں اتنا بڑا تماشا کرنے کی؟"

حاتم نے اس کا دائیاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کے نرمی سے رگڑنا شروع کیا۔ وہ یخ ٹھنڈا تھا۔

"اس جاسوس کے دانت توڑنے کا موقع ملا تھا۔ میں کیسے ضائع جانے دیتا۔" اس نے خفگی سے سر جھٹکا۔ "اس کی جرات کیسے ہوئی تمہاری گردن جلانے کی؟ اب ٹوٹے ہوئے دانت کے ساتھ گھومے۔"

"اور تم اگلا پورا ہفتہ اس سردی میں گزارو۔" حاتم دبے دبے غصے میں بولا۔

"مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اس نے کمال بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

"عادت سی ہو گئی ہے اب تو۔"

اس کا دائیاں ہاتھ گرم ہو گیا تو حاتم نے بائیاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

"ویسے بھی پچھلی مرتبہ ان شعلوں میں پگھلنے کا شرف تمہیں حاصل ہوا تھا۔ اس بار میرا حق بنتا تھا۔" وہ بنا کوئی اثر لیے بولا۔

حاتم نے اس کی ڈھٹائی پہ تاسف سے گہرا سانس لیا۔ "تمہاری بکواس کبھی بند نہیں ہو سکتی؟"

"اگر میری بکواس بند ہو گئی تو تمہاری زندگی بے زار ہو جائے گی قیس عرف مجنوں۔"اس نے گردن اکڑا کے کہا۔

حاتم کے چہرے پہ ناگواری پھیلی۔"تم سے کتنی مرتبہ کہا ہے مجھے مجنوں مت بلایا کرو۔"

"اب قیس نام ہے تو مجنوں تو کہلاؤ گے نا۔"اس نے ڈھٹائی سے شانے اچکائے۔"میرا مشورہ مانو یہاں سے نکلنے کے بعد اپنے لیے کوئی لیلیٰ ڈھونڈ کر اس پہ فدا ہو جانا۔تاکہ پھر تمہیں بھی تاریخ کی کتابوں میں ایک پکے عاشق کے نام سے یاد رکھا جائے۔ویسے بھی مجھے لگتا ہے تمہارے اندر عاشقی لڑانے کے سارے گُر موجود ہیں۔اور تم...."

www.novelsclubb.com

"عباس کے پیچھے ہاتھ دھو کے کیوں پڑے ہو؟"اس سے پہلے اس کی بکواس مزید آگے بڑھتی حاتم نے گفتگو کا رُخ واپس عباس کی طرف موڑا۔

ولی کی کبھی نہ بند ہونے والی زبان کو یکدم تالا لگا۔

پھر اس کے چہرے پہ بے پناہ بدمزگی پھیلی۔"سخت ناپسند ہے وہ مجھے۔"

"تمہیں تو کوئی بھی پسند نہیں ہے ولی۔"

"جب سے اس نے نگران کے آگے تمہاری جھوٹی شکایتیں لگانا شروع کی ہیں تب سے وہ مجھے زہر لگنے لگا ہے۔ تم دیکھنا اگلی مرتبہ میں اس کے نچلے دونوں دانت بھی توڑوں گا۔"

"جی نہیں۔ تم ایسا کچھ نہیں کروگے۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" حاتم نے برہمی سے تنبیہہ کی۔

"جیسے پہلے میں نے تمہاری ان فضول نصیحتوں کو کبھی کسی کھاتے میں لیا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔ شرارتی سی مسکراہٹ، جو اس کی شاطر آنکھوں میں معصومیت بھر دیتی تھی۔

www.novelsclubb.com

ولی کے چہرے کے نقوش انتہائی تیکھے تھے۔ مقناطیسی آنکھیں۔ لمبی ناک۔ باریک ہونٹ۔ لیکن جب وہ مسکراتا تھا تو اس کے چہرے پہ نرمی کا تاثر نمایاں ہوتا تھا۔ وہ نرم تاثر دیکھ کر حاتم کی دن بھر کی تھکاوٹ خود بخود اتر جاتی تھی۔

کچھ لوگوں کا زندگی میں ہونا نعمت ہوتا ہے۔ اور کچھ لوگ بذات خود نعمت ہوتے

ہیں۔ولی اس کے لیے ایک نعمت تھا۔اور حاتم بِن خیام اس نعمت پر اپنے رب کا مشکور تھا۔

اس نے محل کے عیش و آرام میں رہ کر صرف خونی رشتوں سے محبت کرنا سیکھی تھی۔ مگر اس مزدور خانے میں آنے کے بعد ولی وہ پہلا انسان تھا جس کے ساتھ کوئی خونی رشتہ نہ ہونے کے باوجود بھی حاتم کو اس سے محبت تھی۔وہ اس کی ایسے پرواہ کیا کرتا تھا جیسے تیمور حاتم کی کرتا تھا۔وہ اس کے لیے جان بھی دے سکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" حاتم کافی دیر تک اس کے چہرے کو بے مقصد دیکھتا رہا تو اس نے پوچھا۔

"ان اچھے وقتوں کو یاد کر رہا ہوں جب تمہاری زبان ایسے قینچی کی طرح نہیں چلتی تھی۔" اس نے چہرے کا رُخ سامنے کی طرف کر لیا۔

"یہ برا وقت تم اپنے اوپر خود ہی لائے ہو۔اب بھگتو۔" اس نے جواباً شرارت سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔)

حاتم نے آنکھیں کھولیں تو اسے وہ دھند میں لپٹی ہوئی محسوس ہوئیں۔اس نے ہاتھ کی پوروں سے آنکھوں کو مسلا۔آنکھ کی نمی اس کی انگلیوں پہ منتقل ہو گئی۔

"گدھا کہیں کا!" وہ نم آنکھوں سے ولی کی ڈھٹائی پہ محض مسکرا کے رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قلبلار۔

قلبلار کا سمندر سورج کی تیز کرنوں کے تلے چمک رہا تھا۔یہ دوپہر کا وقت تھا اور سورج اپنے عروج پر تھا۔وائل ایک درمیانی جسامت کی کشتی کے عرشے کے جنگلے سے ٹیک لگائے، ہاتھ میں دل کی بناوٹ کا ایک سنہری لاکٹ پکڑے بیٹھا تھا۔ لاکٹ کے ایک طرف **"س"** جبکہ دوسری طرف **"ح"** کندہ تھا۔

کشتی کے دہانے پہ کھڑا ماہی گیر سمندر میں جال پھیلا کر مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھا۔تازہ مچھلیوں کی بدبو ناک سے ٹکراتی تو اس کے چہرے کے تاثرات بگڑتے۔مگر وہ اب کسی حد تک اس ناقابل برداشت بدبُو کا عادی ہو چکا تھا۔کیونکہ وہ اکثر ایسی ہی کسی کشتی میں سوار ہو کے سمندر کے بیچ و بیچ پایا کرتا تھا۔

اسے پورے قلبلار میں صرف چار مقام ہی پسند تھے۔ مسجد کے مینار کی چھت، برگد کا وہ پیڑ جہاں وہ پہلی مرتبہ فیض سے ملا تھا، نیلی جھیل اور سمندر۔ وہ پریشان ہوتا تب بھی انہی چاروں جگہوں میں سے ایک پر چلا جایا کرتا۔ اور خوش ہوتا تب بھی۔ یہ تینوں جگہیں اس کے لیے آرام گاہیں تھیں۔ اطمینان کے ایسے مکان جہاں وہ دنیا جہان سے بے خبر ہو کر سکون کی تلاش میں جایا کرتا تھا۔ اسے لوگ اچھے نہیں لگتے تھے۔ لوگوں کی موجودگی میں رہنا پسند نہیں تھا۔ تنہائی ہجوم سے بہتر تھی۔

"تمہیں اسے ناراض کر کے برا لگ رہا ہے؟" اس آواز پہ وائل نے نگاہ اٹھا کے اپنے دائیں جانب دیکھا تو نظر اس ننھی پڑی پہ پڑی۔ سجانی پر۔

ہلکے بھورے رنگ کی آنکھیں اس پہ مرکوز کیے وہ قدرے پریشان لگ رہی تھی۔ لمبے لہنگا نما سنہری لباس کے اوپر کہنیوں تک آتے آستینوں والی سیاہ رنگ کی بند جیکٹ پہنے، وہ دونوں ہاتھ گھٹنوں کے گرد باندھ کے بیٹھی تھی۔ گھنگریالے، سیاہ بال دونوں طرف سے تھوڑے تھوڑے اکٹھے کر کے پیچھے سنہری رنگ کے

ربن میں مقید تھے۔ بھوری آنکھوں میں بے پناہ الجھن تھی۔

"بہت زیادہ۔" اس نے اعتراف کیا۔

"تو تم کیوں لڑے اس سے؟" سبحانی نے سنجیدگی سے اگلا سوال کیا۔

"میں لڑا اس سے؟" وائل نے بے یقینی سے آنکھیں پھیلائیں۔ "وہ لڑنے آئی تھی مجھ سے۔ میں تو انتہائی مہذب طریقے سے بات کرنے والا تھا۔ اور اس نے آگے سے پتہ نہیں کس کا غصہ مجھ پر نکالا ہے۔" خفگی سے سر جھٹکا۔

"تم وعدہ خلافی کرنے پر پچھتا رہے ہو؟" وہ اب سامنے خلا میں دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

"نہیں۔" یک لفظی جواب کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔

ماہی گیر جال میں پھنسیں مچھلیاں ٹوکریوں میں رکھنے اس کے قریب سے گزر کے کشتی کی دوسری طرف گیا۔

"صرف امیرہ کے ساتھ وعدہ خلافی کرنے پر پچھتا رہا ہوں۔" کافی دیر تک جب وہ کچھ نہیں بولی تو اس نے صرف پہ زور دیتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑنا چاہا۔

سبحانی نے گردن اس کی طرف موڑی۔"پھر ایسا کیوں کر رہے ہو؟"

"کیونکہ میرے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ابوالحسن کو جلد از جلد زندان سے نکالنا ہو گا۔میں رمضان کے ختم ہونے کا انتظار نہیں کر سکتا۔"اس نے بے زار آواز میں وضاحت دی۔

"پھر بھی تمہیں اس کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"سبحانی نے افسوس سے گردن دائیں بائیں ہلائی۔

"میرا کوئی ارادہ نہیں تھا اس سے کیا وعدہ توڑنے کا۔مگر وہ محل کی عمارت سے بخوبی واقف ہے۔مجھے کوئی بھی منصوبہ بنانے کے لیے اس کی رہنمائی درکار ہے۔"

ماہی گیر دوبارہ اس کے پاس سے گزرا تو رک کر اچنبھے سے اسے دیکھنے لگا۔

"تم کس سے باتیں کر رہے ہو؟"وہ شدید الجھن کا شکار تھا۔

وائل نے گردن اٹھا کے اسے دیکھا۔

"اپنی بہن سے۔"

"مگر وہ کہاں ہے؟"

کچھ لمحے پہلے والی بیزاری یکدم اداسی میں بدل گئی۔اس نے گردن موڑ کر سبحانی کو دیکھا۔وہ پھیکا سا مسکرائی۔

سات برس پہلے وہ گیارہ سال کی تھی۔اور آج سات برس بعد بھی وہ گیارہ سال کی ہی تھی۔

"میرے تصور میں۔"وہ بے جان سی آواز میں بولا۔

ماہی گیر اسے عجیب نگاہوں سے دیکھتا واپس اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

"اب تم کیا کرو گے؟"ننھی پری نے معصومیت سے پوچھا۔

اس کے کندھے ڈھیلے پڑے۔"وہی سوچ رہا ہوں کہ کیا کرنا ہے۔"

"تم امیرہ کے ساتھ کوئی سختی مت کرنا۔"اس کی آواز میں منت تھی۔

"ظاہر ہے تم تو اسی کی طرفداری کرو گی نا۔آخر اس کی...."اچانک اس کے پالتو باز نے آکر اس کے سر میں چونچ ماری تو وہ اچھل کے اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ وائل کے پیچھے ہی اڑتا ہوا آیا تھا اور اب کافی دیر سے آسمان پہ چکر لگا رہا تھا۔

"باز گیر یہ کیا حرکت تھی؟"خفگی سے کہتے ہوئے اس نے بازو پھیلایا تاکہ وہ آ

کر وہاں بیٹھ جائے۔

مگر وہ اس کے سر پہ چکر کاٹتا رہا۔ اسے تشویش ہوئی۔ باز یگر کبھی بھی ایسا نہیں کرتا تھا۔ وائل جب بھی اپنا بازو پھیلاتا تھا وہ وہاں آ کر ضرور بیٹھتا تھا۔

اس نے ہاتھ سر کی پشت پہ پھیر کے سامنے کیا تو انگلیوں کی پوروں پہ خون لگا تھا۔ باز یگر نے اس کی چوٹ پہ اپنی نوکیلی چونچ مار کے اس کا زخم پھر سے اکھاڑ دیا تھا۔ اس نے ناگواری سے گہرا سانس لیا۔

اس کی نظر قریب گرے اخبار پہ پڑی تو اسے احساس ہوا آج صبح امیرہ سے ہوئی تلخ کلامی کے بعد وہ اخبار پڑھنا بھول گیا تھا۔ ورنہ وہ باقاعدگی سے ہر صبح اخبار پڑھا کرتا تھا۔ اس نے جھک کر اخبار اٹھائی مگر پہلی ہی سرخی پڑھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔

"جبلین کے وزیر اعلیٰ، ابوالحسن کو بغاوت کے لیے عمر قید کی سزا۔"

یہ خبر تازہ ترین تھی۔ کیونکہ گذشتہ روز کے اخبار میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

مگر غابانوی قانون کے مطابق بغاوت کی سزا موت تو تھی۔ پھر ابوالحسن کو عمر قید کیوں؟

اس کا ذہن الجھا۔ مگر اسے یہ خبر پڑھ کر جیسے اطمینان سا ملا تھا۔ یہ اس کے حق میں بہتر تھا۔ اسے وقت درکار تھا اور وہ اسے مل گیا تھا۔ اس کا دماغ تیزی کام کرتے ہوئے آگے کی منصوبہ بندی طے کر رہا تھا۔ باز یگر ابھی تک اس کے سر پر شور مچاتا، چکر کاٹ رہا تھا۔ وائل کو اب اس پرندے پہ مزید غصہ آنے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قلبلار میں عصر ڈھل چکی تھی۔ غزال کے تہہ خانے میں موجود چھوٹے سے روشن دان سے نیلا آسمان جھلک رہا تھا۔ سفید چراغ کے اندر جلتی نارنجی آگ نے سارے میں روشنی پھیلا رکھی تھی۔

وہ پانچوں اس وقت وہاں موجود تھے۔ حرم دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا گھڑی کی ٹک ٹک سن رہا تھا۔ حریم تین کرسیاں جوڑ کے ان پر چت لیٹی کتاب پڑھ رہی تھی۔ علینہ، امیرہ، اور سیف بھی لکڑی کی کرسیوں پہ براجمان تھے۔

"مجھے نہیں لگتا وہ آئے گا۔" سیف امیرہ کو دیکھتے ہوئے بولا تو حریم کے علاوہ سب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ "عصر سے پہلے کا وقت دیا تھا اس نے۔ اور اب تو

دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔"

"وہ وقت کی بہت پابندی کرتا ہے۔آج سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہمیں ملنے کا کہہ کے وہ خود غائب ہو گیا ہو۔"علینہ کی آواز میں فکر مندی جھلکی۔

امیرہ کو بھی اب پریشانی ستانے لگی تھی۔ صبح ان کے جھگڑے کے بعد سے لے کر اب تک وہ غائب تھا۔ کہیں وہ کسی مصیبت میں تو نہیں ہے؟

"میرا خیال ہے وہ کسی مسئلے میں پھنسا ہوا ہے۔" حرم نے ہلکے سے شانے اچکائے۔

حریم نے کتاب بند کی اور سیدھی ہو کے بیٹھی۔

"جہنم میں جائے میری طرف سے۔"جھرجھری لے کے لاپروائی سے بولی۔" روزہ کھلنے میں تھوڑا سا وقت رہ گیا ہے۔میں تو افطاری کرنے جا رہی ہوں۔"وہ اٹھی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

اور پھر اچانک امیرہ کے دل پہ ایک شناسا احساس نے دستک دی۔ایک ناقابلِ سمجھ سا احساس جو اس کے آنے سے پہلے اس کی آمد سے مطلع کر دیتا تھا۔امیرہ کی

نظریں فوراً سیڑھیوں کی طرف جاتی حریم کی طرف مڑیں۔

وہ دوسری سیڑھی پر ہی تھی کہ اس کے منہ سے ایک بے ساختہ چیخ باہر خارج ہوئی۔اگلے لمحے اس کا پاؤں پھسلا اور وہ زمین پہ گری۔

"کیا ہوا ریم؟" حرم تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

وائل سیڑھیوں سے نمودار ہوا اور ان دونوں کو نظرانداز کر کے طویل میز کی طرف آیا۔

"ایسے جن کی طرح نازل ہونا لازم ہے کیا تم پر؟" وہ بلبلاتے ہوئے اٹھی۔

وائل نے ایک مرتبہ پھر اسے نظرانداز کیا۔حریم نے ناگواری سے آنکھیں گول گمائیں۔

www.novelsclubb.com

"کہاں تھے تم سیٹھ؟" حرم اس کے پیچھے آیا۔

"علینہ کے علاوہ سب لوگ باہر جاؤ۔" تحکم بھری آواز میں کہتا وہ امیرہ کے پاس سے گزرا تو نظر اٹھا کے اسے دیکھا تک نہیں۔

"مگر تم تھے کہاں؟"

"سمندر کا چکر لگانے گیا تھا۔"اس کی طرف مڑے بغیر اس نے سرسری سا جواب دیا۔

حریم کے ہونٹ بے یقینی سے کھلے۔"یعنی ہمیں یہاں بٹھا کے خود تم تفریح کرنے میں مصروف تھے؟"

"بالکل۔اب جاؤ۔"سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔

حریم نے دانت کچکچائے۔پھر پیر پٹختی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔حرم اور سیف نے بھی اس کی پیروی کی۔امیرہ نے رک کر ایک مرتبہ پھر وائل کی طرف دیکھا۔وہ اب بھی اس سے نظریں پھیرے ہوئے تھا۔

اس نے رخ سیڑھیوں کی جانب کر لیا۔

"میں چاہتا ہوں تم میرا ایک خاص کام کرو۔"وائل کا سپاٹ لہجہ اسے اپنے پیچھے سنائی دیا۔

"کیسا کام؟"علینہ کی الجھن بھری آواز۔

"وہی جس میں تم ماہر ہو۔"

www.novelsclubb.com

وہ آخری سیڑھی پر تھی جب اس نے یہ جملہ سنا تھا۔اس کے بعد لوگوں کے شور کے باعث علینہ اور وائل کی آوازیں مانند پڑ گئیں۔چونکہ یہ افطار کا وقت تھا اس لیے اوپری خانے پر لوگوں کا بھرپور رش لگا تھا۔رمضان کے لیے حریم نے اپنے قہوہ خانے کو بعام خانے میں بدل دیا تھا۔

وہ باورچی خانے والے میز کے پاس آئی اور کرسی نکال کر بیٹھ گئی۔البتہ ذہن بار بار وائل کی طرف بٹ رہا تھا۔وہ صبح اس پہ غصہ کر کے پچھتا رہی تھی۔شاید اس نے جذبات میں آکر نامناسب ردِ عمل دے دیا تھا۔وہ ایسی تو نہیں تھی۔کہیں حریم کے ساتھ رہ کر اسے بھی تو دوسروں کا غصہ کسی اور پہ نکالنے کی عادت نہیں پڑتی جا رہی تھی؟

www.novelsclubb.com

کچھ دیر بعد جب وہ روزہ کھول چکی تو حرم نے پاس آکر ایک ٹرے اسے تھمائی۔ تین کھجوریں۔ایک پانی کا گلاس۔چٹنی کے ساتھ پکوڑے۔اور تازہ کٹے پھل۔ لکڑی کی ٹرے میں افطاری کا سارا سامان موجود تھا۔

"علینہ کو دے آؤ۔اس کی افطاری ہے۔میں جاؤں گا تو وائل غصہ کرے گا۔"

اس نے التجا سے بھرپور لہجے میں کہا تو وہ اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

"خود تو روزہ رکھتا نہیں۔اور دوسروں کو چین سے افطار نہیں کرنے دیتا۔"

حریم نے کڑوے منہ سے تبصرہ کیا تھا۔

وہ نیچے آئی تو تہہ خانے میں کوئی بھی نہیں تھا۔امیرہ نے گردن گما کر چاروں کونوں میں دیکھا۔ مگر وہ دونوں کہیں نظر نہیں آئے۔وہ تہہ خانے کے دوسرے دروازے کی طرف آئی۔اسے کھولنا چاہا تو وہ جامد رہا۔شاید اس پہ باہر سے تالا لگا تھا۔جب وہ لوگ اوپر گئے تھے تو دروازے کو اندر سے تالا لگا کر بند کیا گیا تھا۔ مگر اب؟

یقیناً وہ دونوں وائل کا خاص کام کرنے یہیں سے نکل کر باہر چلے گئے تھے۔

امیرہ نے سر جھٹکا اور واپس اوپر آ گئی۔

وہ ٹرے میز پہ رکھنے لگی تو کسی نے اس کے ہاتھ سے لے لی۔امیرہ ے گردن اٹھا کے دیکھا۔وہ فیض تھا۔وہ چونکی۔

"تم؟ تمہیں تو اس وقت اپنے گاؤں میں ہونا چاہیے؟"

اسے واقعی بہت حیرانی ہوئی تھی کیونکہ فیض ایک مہینے کے لیے گیا تھا۔اور اب اگلے ہی دن وہ واپس لوٹ آیا تھا۔

"ارادہ بدل دیا میں نے اپنا۔" کھجور منہ میں ڈالتے،وہ سامنے والی کرسی کھینچ کر بیٹھا۔

حرم اور حریم سے وہ یقیناً پہلے ہی مل چکا تھا۔

"کب آئے تم؟" امیرہ اس کے مخالف سمت والی کرسی کھینچ کر بیٹھی۔

"دوپہر کو۔" وہ اب پکوڑے چٹنی میں ڈبو رہا تھا۔البتہ اس کا ذہن کچھ الجھا ہوا سا محسوس ہوتا تھا۔

امیرہ نے آنکھیں چھوٹی کیے اسے غور سے دیکھا۔اس کے لب بے یقینی سے کھلے۔"تم روئے ہو؟"

اس کی آنکھیں لال متورم تھیں۔

فیض نے جب کوئی جواب نہ دیا تو امیرہ نے بھی کریدنا مناسب نہیں سمجھا۔

ویسے بھی وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنے بے تکلف نہیں ہوتے تھے۔اور امیرہ

کی تو اس پورے گروہ میں حرم اور حریم کے سوا کسی اور کے ساتھ اتنی بے تکلفی بھی نہیں تھی۔

اس نے گردن پھیر کے دیکھا۔ حریم سمیت سب نو عمر ملازم گاہکوں کو کھانا پروسنے میں مصروف تھے۔ وہ مغرب کی نماز پڑھنے تہہ خانے میں چلی آئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ تراویح پڑھنے کے بعد تھوڑی دیر تک اپنے کمرے میں بے وجہ بیٹھی رہی۔ جب نیچے آئی تو صحن میں حرم، حریم اور سیف کو آمنے سامنے بچھی دو چارپائیوں پہ بیٹھے ہنس ہنس کے باتیں کرتے پایا۔ چارپائیوں کے گرد طویل قامت چراغ جل رہے تھے۔ جن میں جلتی آگ نظر نہیں آتی تھی۔ بس اس کی مدھم روشنی سارے صحن میں پھیلی تھی۔

حرم اور حریم کے علاوہ سب بازیگر جلد سونے کے عادی تھے۔ البتہ وہ دونوں سحور تک جاگ کے یا تو لڈو کھیلتے یا پھر کوئی اور تفریحی سرگرمی کر لیتے۔ اور اب اس کام میں ان کا بھرپور ساتھ دینے کے لیے ایک اور فرد آ گیا تھا۔ سیف۔ تھوڑی

دیر قبل وہ لوگ، آج صبح وائل نے غزال جا کے جو تماشا لگایا تھا، اس پہ گفتگو کر رہے تھے۔ اور امیرہ نے ان کی ساری باتیں سنی تھیں۔ وہ جو صبح سے اس قدر احساسِ ندامت کا شکار تھی، وہ محو ہو گیا تھا۔

شاید وائل بن آدم واقعی اس رویے کا مستحق تھا جس میں آج صبح امیرہ نے اس سے بات کی تھی۔ وہ ریم کو جان سے مارنے کی دھمکی کیسے دے سکتا ہے؟ وہ بھی اپنے اور اس کے بیچ ہوئی ایک معمولی سی بحس کی وجہ سے؟ جس میں حریم کا تو کوئی خاص قصور بھی نہیں تھا۔

"یہ آزاد منزل والی تختی کہاں گئی؟" سیف نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

"ہوا کے باعث گر کے ٹوٹ گئی ہو گی۔" حریم نے شانے اچکائے۔

اتنے میں گیٹ کھلنے کی آواز آئی تو ان سب کی نگاہیں اس طرف اٹھیں۔ امیرہ برآمدے میں موجود ستون پہ ہاتھ رکھے کھڑی رہی۔ وہ احساس اسے پھر سے ہونے لگا تھا۔

وائل اور علینہ آگے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ علینہ بائیں جانب لگے زینے چڑھ

کے اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی جبکہ وائل ان لوگوں کی طرف آ گیا۔

"ایسا کون سا طوفان ہے جو آیا اور ہمیں پتہ نہیں چلا؟" حرم ذرا تجسس کا شکار ہوا۔

امیرہ کو یہاں سے حرم کی پشت دکھ رہی تھی۔اور وائل اس کے عین سامنے کھڑا تھا۔

"آیا تھا ایک طوفان۔ تم خود اپنی آنکھوں سے بھی دیکھتے تو تمہیں یقین نہیں آتا۔ میں بتاؤں گا تو بالکل ہی نہیں آئے گا۔" طنزیہ لہجے میں وہ حرم سے مخاطب تھا۔ مگر سنا امیرہ کو رہا تھا۔

چراغوں کی مدھم روشنی میں بھی وہ اس کی طوفانی آنکھوں میں نظر آنے والا تاثر دیکھ سکتی تھی۔لا ابالی پن۔

یعنی اسے اپنی حرکتوں پر کوئی پچھتاوا نہیں؟ خیر اس میں کیا ہی نئی بات ہے۔یہ تو اس کی فطرت میں تھا۔

"ہم نہران کب جا رہے ہیں؟" وائل کے طنز ان تینوں کے سروں کے اوپر سے

گزر گئے تھے۔اسی لیے سیف نے اس کی بات کو نظر انداز کیے وہ سوال کیا جس کا جواب جاننے میں سب کو ہی بہت جلدی تھی۔

"فی الحال اس بارے میں کوئی بات نہیں ہو گی۔" وہ مزید کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے چلا گیا تو وہ تینوں سر جھٹک کر رہ گئے۔

اس کا کمرہ نچلی منزل پہ تھا۔دروازہ کھول کے وہ اندر داخل ہوا اور پچھلی طرف مڑے بغیر پٹاخ اپنے پیچھے اسے زور سے بند کر دیا۔امیرہ نے تند ہی سے گہرا سانس لیا اور اونچے قہقہے لگاتے حرم، حریم اور سیف کو چھوڑ کر باورچی خانے سے میوے لینے چلی گئی۔

کچھ دیر بعد میووں کی پلیٹ ہاتھ میں لیے وہ ان تینوں کے پاس آئی اور اسے چار پائی کے سرہانے رکھنے کے بعد حریم کے دائیں جانب بیٹھ گئی۔وہ مسکرائی تو جواباً امیرہ بھی مسکرا دی۔امیرہ نے چار پانچ بادام اٹھائے اور حرم کی طرف متوجہ ہوئی۔ جو حریم سے پوچھ رہا تھا۔

"آج کل تم کون سی کتاب پڑھ رہی ہو ریم؟" اس نے آگے بڑھ کے چند میوے

ہتھیلی میں بھرے۔

"آج کل میں کوئی افسانوی کتاب نہیں پڑھ رہی۔" حریم کی گردن اونچی ہوئی۔

"اوں ہوں۔" حرم نے ایک میوہ منہ میں اچھالا۔

"میں ایک تاریخی کتاب پڑھ رہی ہوں۔"

امیرہ نے ایک بادام منہ میں ڈالا اور اسے آہستگی سے چبانے لگی۔

حریم دونوں ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھی اور بہت پُرجوشی سے بتانے لگی۔ "شہزادی ساشا اور اس کے بھائی سمر بن خالد پہ لکھی گئی ہے۔"

منہ میں موجود بادام امیرہ کو یکدم کڑوا لگنے لگا۔ اس نے اسے دانتوں کے نیچے دبا لیا۔

www.novelsclubb.com

"وہ سات سال کا تھا جب اپنی ماں کے ساتھ قلبلار میں موجود سلطان حاکم کے پرانے محل میں کچھ دن رہنے کے لیے آیا تھا۔ اور وہیں سے اسے اغوا کر لیا گیا تھا۔ سلطانہ بیٹے کی جدائی کے روگ میں دماغی توازن کھو بیٹھیں۔ شروع کے چند سال سلطان خالد نے اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے کی کوشش کی۔ لیکن جب انہوں نے تھک

کر ہار مان لی تو یہ ذمہ داری شہزادی ساشا نے اپنے کندھوں پہ لے لی۔ لوگ تو کہتے ہیں اب تک وہ مر، مرا گیا ہو گا۔ مگر شہزادی ساشا بضد ہے کہ اس کا جڑواں بھائی زندہ ہے۔ وہ اسے ایک طویل عرصے سے تلاش کر رہی ہے۔"

"ہو سکتا ہے شہزادہ واقعی زندہ ہو؟" حرم نے ایک امکان سامنے رکھا۔

"اگر وہ زندہ ہوتا تو خود واپس آنے کی کوشش کرتا۔ مگر پچھلے سترہ سالوں میں اس کی طرف سے ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔"

"ہو سکتا ہے اس کے اغوا کاروں نے اس کی واپسی کے سارے راستے بند کر دیئے ہوں۔ صرف سات سال کا تھا وہ ریم۔ ایک سات سالہ بچے کو جو بتایا جائے وہ اس پہ یقین کر لیتا ہے۔ ممکن ہے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ وہ ایک گمشدہ شہزادہ ہے۔ ویسے بھی ایک لمبا عرصہ گزر گیا ہے۔ کیا پتہ شہزادی نے اسے دیکھا ہو اور جان ہی نہ سکی ہو کہ وہ اس کا بھائی ہے۔" حرم تحمل مزاجی سے سمجھا رہا تھا۔

"کیا مطلب شہزادی کو معلوم نہ ہوا ہو؟"

وہ دونوں ایک ایسے گمشدہ شہزادے کا ذکر کر رہے تھے جو ان کے لیے اجنبی

تھا۔ مگر انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ان کی باتیں امیرہ کے دل پہ چھریوں کی طرح لگ رہی ہیں۔ کیونکہ وہ اس کے لیے اجنبی نہیں تھا۔

"اتنے طویل عرصے میں لوگ بدل جاتے ہیں ریم۔ یا پھر ان کے چہرے ہماری یادداشت میں کہیں کھو جاتے ہیں۔ اتنے کہ ہم انہیں پہچان ہی نہیں پاتے۔"

"یعنی شہزادی ساشا خواہ مخواہ اپنا وقت اور توانائی ضائع کر رہی ہے؟" سیف نے اس ساری گفتگو میں پہلی مرتبہ حوالہ دیا تھا۔

"بالکل۔ مجھے نہیں پتہ، شہزادہ زندہ ہے یا نہیں۔ لیکن میں اتنا ضرور جانتی ہوں کہ وہ اسے نہیں ملے گا۔ کھوئے ہوئے بچے واپس نہیں ملتے۔" حریم کی آواز ٹوٹی۔

حرم اور امیرہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

"اسے بھی اس کا بھائی واپس نہیں ملے گا۔"

مضبوط لہجے میں کہا گیا حریم کا آخری جملہ امیرہ کو مزید تکلیف میں مبتلا کر گیا۔ اس نے چہرہ جھکا لیا۔

چند لمحوں کے لیے صحن میں سناٹا چھا گیا۔

"امیرہ تمہارا تو سارا بچپن سلطان حاکم کے محلوں میں گزرا ہے۔ کیا تم نے کبھی شہزادے سمر کو دیکھا؟" حرم نے کھنکھار کے گفتگو جاری رکھنا چاہی۔

"ہاں امیرہ بتاؤ۔ کیا تم نے اسے کبھی دیکھا؟ کتاب میں لکھا ہے کہ وہ ہر سال، گرما اور سرما کے موسم میں اپنی کسی دوست سے ملنے قلبلار آیا کرتا تھا۔" حریم بھی اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"دوست؟" وہ سُن سی آواز میں بڑبڑائی۔

"ہاں۔ دوست۔"

اس نے سر اٹھا کے باری باری ان تینوں کے چہرے دیکھے۔ جو اس کے جواب کے منتظر تھے۔

www.novelsclubb.com

"ہاں آتا تھا۔" اس کی آواز کسی کھائی سے آئی تھی۔ بے حد مدھم۔

"یعنی تم نے اسے دیکھا ہے؟" حریم پُرجوش ہوئی۔

اس نے گردن اوپر نیچے ہلائی۔

"تو اس کا مطلب تم اسے پہچان لو گی؟"

اس نے سر کو دائیں بائیں جنبش دی۔

"مگر کیوں؟ تمہاری تو یادداشت بھی اتنی تیز ہے یار۔" حریم مایوس انداز میں بولی۔

اس کی آنکھوں کے پیچھے بہت سارا گرم پانی جمع ہونے لگا۔

"جیسا کہ حرم نے کہا، لوگوں کے چہرے بدل جاتے ہیں۔" وہ ضبط سے بولی۔

"کیا ہی فائدہ تمہاری انوکھی قوت یادداشت کا۔" حریم نے افسوس سے ہاتھ جھلایا۔

امیرہ کے لیے مزید وہاں رکنا محال تھا۔ وہ جلدی سے اٹھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" حریم نے اس کی کلائی پکڑی۔

"مجھے نیند آ رہی ہے۔" سونے کا کہہ کر وہ جلدی سے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔

بمشکل زینے چڑھ کے اوپر اپنے کمرے میں آئی۔ جلدی سے دروازہ بند کیا۔ اور دروازے کے ساتھ ٹیک لگائے بے اختیار زمین پہ کھسکتی چلی گئی۔ آنسوں زارو

قطار اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

اسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا تھا۔

اور اسے اپنا دل بھی گہرے اندھیروں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

اس نے دروازے کے قریب لٹکتی رسی کو کھینچا تو وسط میں لگا فانوس جل اٹھا۔ ہر سو روشنی پھیل گئی۔

امیرہ چونکی۔

اسے اپنے کمرے میں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ کتب خانے میں موجود تھی۔

ہڑبڑاہٹ میں وہ دائیں طرف بنے اپنے کمرے میں جانے کی بجائے بائیں طرف کمروں میں سے ایک میں آگئی تھی۔

www.novelsclubb.com

اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے گلے سے اپنا حجاب ہٹا کے سنہری رنگ کی ایک زنجیر سامنے کی۔ اس کے دہانے پہ ایک سنہری دل لٹک رہا تھا۔ امیرہ نے اسے اپنی ہتھیلی میں لیا۔ وہاں "ا" لکھا تھا۔ پھر اس نے کانپتے ہاتھوں سے دل کو پلٹایا۔ دوسری طرف "س" گڑھا تھا۔

اس نے دل اپنی مٹھی میں دبایا اور کرب سے آنکھیں میچیں۔لاتعداد آنسوں اس کے گالوں سے لڑھک کے تھوڑی تلے موجود کپڑے میں جذب ہوتے گئے۔

"کہاں ہو تم سمر؟"اس کی رندھی ہوئی مدھم سی آواز فضا میں گونجی۔"تم نے تو کہا تھا ہم ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔اور اب ساتھ تو کیا، تم کہیں بھی نہیں ہو۔"

امیرہ نے بے بسی سے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد دائرے کی صورت حائل کیے۔

"سب کو لگتا ہے میں بہت خوش قسمت ہوں جو مجھے چیزیں بھولتی نہیں ہیں۔ لیکن اس سے تو بہتر یہ ہوتا کہ مجھے کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔نہ تم۔نہ تمہارے ساتھ گزرے اچھے دن۔اور نہ تم سے فراق کی کٹھن یادیں۔جو نہ مجھے کھل کے جینے دیتی ہیں۔اور یہ نہ مجھے کبھی چین سے مرنے دیں گی۔"وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

امیرہ نے پچھلے سترہ سالوں میں جتنی شدت سے سمر بن خالد کی واپسی کی دعائیں مانگیں تھیں۔اتنی شدت سے کسی نے کسی کے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا ہو گا۔لیکن وہ پھر بھی نہیں ملتا تھا۔قسمت میں اس کا ساتھ نہیں تھا۔اور دل اسے بھلانے کو

تیار نہیں تھا۔اتنے طویل عرصے میں وہ چاہنے کے باوجود بھی اسے بھلا نہیں سکی تھی۔ جتنا وہ اسے بھولنے کی کوشش کرتی تھی،اتنی ہی شدت سے وہ یاد آتا تھا۔وہ پہلا شخص تھا جس کے آگے اس نے اپنا دل کھول کے رکھا تھا۔وہ پہلا انسان تھا جس کے ساتھ اس نے دوستی کی تھی۔اور وہی اس کی زندگی کا پہلا رشتہ تھا جس نے اسے یہ احساس دلایا تھا کہ وہ بھی کسی کے لیے اہم ہو سکتی ہے۔ورنہ تو امیرہ کسی کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔

وہ کسی کی کسی کے ساتھ کی گئی بے وفائی کی نشانی تھی۔ کسی کے گناہ کا جیتا جاگتا ثبوت تھی۔ کسی سے بے ہوشی کی حالت میں ہوئی خطا کی علامت تھی۔ حوا کی یہ بیٹی کچھ بھی تھی، مگر اہم نہیں تھی۔کم سے کم سمر بن خالد کے اس کی زندگی میں داخلے سے پہلے تک۔

لیکن پھر وہ آیا۔ کسی بہار طرح۔

اس نے امیرہ کے اندر سب کچھ بدل دیا۔اس کی موجودگی میں امیرہ نے زندگی کو پہلی مرتبہ کسی زندہ دل انسان کی آنکھوں سے دیکھا۔اور اسے زندگی اتنی بھی بری

نہیں لگی، جتنا وہ سمجھے بیٹھی تھی۔ سمر نے اس کے اندر کے احساسِ کمتری کو ختم کر دیا۔ اسے خود کی نظروں میں معتبر بننا سکھایا۔ اپنی ذات کی قدر و قیمت پہچاننا سکھائی ۔خود اپنی عزت کرنا سکھایا۔ لوگوں سے خود کو عزت دلوانا سکھایا۔

اتنی چھوٹی سی عمر میں بھی وہ عقلمند شہزادہ اسے بڑی بڑی باتیں سمجھا گیا۔

اور پھر وہ چلا گیا۔ ہوا کے ہلکے سے جھونکے کی طرح۔ خالی ہاتھ۔ اپنے ساتھ کچھ بھی لیے بغیر۔

اور جو وہ اپنے پیچھے چھوڑ کے گیا وہ ہمیشہ کے لیے امیرہ کے ساتھ رہ گیا۔ لیکن وہ خود اب اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ جس نے اس کے دکھ سکھ کا ساتھی بننا تھا وہ اب صرف اس کی یادوں میں تھا۔ زندگی میں کہیں نہیں تھا۔ اور وہ کیوں نہیں تھا؟ اس کا جواب اس کے پاس تو کیا، کسی کے پاس بھی نہیں تھا۔

امیرہ نے افسردگی سے سر گھٹنوں میں دے لیا۔ اور بے آواز رونے لگی۔

وہ کتنی ہی دیر وہاں بیٹھی رہی اسے اندازہ نہیں ہوا۔

"کاش کوئی معجزہ ہو۔ میں تمہیں سوچوں۔ اور تم میرے پاس ہو۔" اس نے

غمگیں آواز میں آہستگی سے بولتے ہوئے سر اٹھایا۔اور اگلے لمحے اس کے وجود تلے سے زمین کھسک گئی۔

وائل سینے پہ ہاتھ باندھے عین اس کے سامنے کھڑا تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔وہ سیاہ رنگ کے ڈھیلے سے لباس میں ملبوس تھا۔پیشانی پہ بکھرے سیاہ بالوں سے پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔یقیناً وہ ابھی ابھی نہا کر آیا تھا۔

امیرہ کے چہرے کا رُخ بے ساختہ بائیں طرف بنے دروازے کی طرف گیا۔جو اس وقت کھلا تھا۔اس دروازے کے پار ایک گول زینہ تھا جو سیدھا وائل کے کمرے میں اترتا تھا۔

وہ وہاں کب آیا؟اور اسے اس کے آنے کا حساس کیوں نہیں ہوا؟اسے تو ہمیشہ اس کی موجودگی کا ادراک ہو جاتا تھا۔

لیکن سمر کو سوچتے وقت اس کی کوئی بھی حس کام کرنے کے قابل کہاں رہتی تھی۔

یہ وہ زخم تھا جو نہ بھرتا تھا۔نہ بھولتا تھا۔

امیرہ نے چہرہ واپس وائل کی طرف موڑا۔اس کی نظریں اس کے گلے میں لٹکتے ہوئے لاکٹ پہ مرکوز تھیں۔امیرہ نے فوراً اپنا گلا حجاب سے ڈھانپا۔

وائل نے نظریں اٹھا کے اس کی نم آنکھوں میں دیکھا۔

"تمہارا کوئی اور بھی کھویا ہے کیا؟"اس کی آواز بے تاثر تھی۔

امیرہ نے ہڑبڑا کے اپنے آنسوں پونچھے اور جلدی سے اٹھی۔اپنے پیچھے دروازہ کھول کے اس کے سوالوں سے بچنا چاہا۔لیکن اس سے پہلے وہ باہر نکلتی اس نے تیزی سے آگے بڑھ کے دروازہ بند کر دیا۔

"امیرہ مجھ سے بات کرو۔مجھے یوں نظرانداز مت کرو۔"اس کی مدھم مگر برہم آواز بہت قریب سے آئی تھی۔

www.novelsclubb.com

وہ اس کی طرف مڑی۔وہ اپنا دائیاں ہاتھ دروازے پہ رکھے اتنا قریب کھڑا تھا کہ اس کے تیزی سے دھڑکتے دل کی آواز سنائی دے رہی تھی۔دھک۔دھک۔دھک۔

اس نے ہمیشہ محسوس کیا تھا اس کے دل کی دھڑکن کسی عام انسان کے مقابلے

ہمیشہ تند و تیز اور سماعت میں قدرے اونچی ہوتی تھی۔فاصلے سے بھی واضح سنائی دیتی تھی۔اور اب تو وہ اتنے قریب کھڑا تھا کہ....

یقیناً اس کے اس کے چہرے پہ غیر آرامدہ تاثرات نمایاں ہوئے تھے اسی لیے اس نے فوراً اپنا لمبا بازو دروازے سے ہٹایا اور دو قدم پیچھے ہو کے کھڑا ہوا۔

"مجھ سے بات کرو۔شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"اس کا لہجہ نرم ہوا۔

امیرہ نے نم آنکھیں اٹھا کے اس کی سرمئی آنکھوں میں جھانکا۔اور پھر کسی خواب کی سی کیفیت میں بولی۔"اس معاملے میں تم تو کیا کوئی بھی میری مدد نہیں کر سکتا۔"

ہمیشہ پُرامید نظر آنے والی امیرہ کی گہری سنہری آنکھوں کا درد، وائل کو پتھر کا مجسمہ بنا گیا۔وہ واپس پلٹی اور دروازہ کھول کے باہر چلی گئی۔اس مرتبہ اس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔وہ کر ہی نہیں سکا۔امیرہ کی یہ حالت دیکھ کر اس کے دل و دماغ جیسے بری طرح دھند کی لپٹ میں آ گئے تھے۔وہ روتی تھی تو اس کی سانسیں اٹک جاتی تھیں۔

وہ کس کے لیے آنسوں بہا رہی تھی؟ کون تھا وہ خوش نصیب جس کے پاس ہونے کی وہ دعائیں مانگ رہی تھی؟ جس کے لیے معجزات کے ممکن ہونے کی التجائیں کر رہی تھی؟

وہ جو کوئی بھی تھا اس کا نام "س" سے شروع ہوتا تھا۔ اس نے یہ حرف امیرہ کے لاکٹ پہ دیکھا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے؟" اس نے پُر سوچ آواز میں خود سے ہی جیسے سوال کیا۔

اچانک باہر سے کسی کے سیڑھیاں چڑھنے کی آہٹ سنائی دی تو وہ چونکا۔

وہ احتیاط سے باہر نکلا۔ آنے والا سیڑھیاں چڑھنے کے بعد دائیں طرف بنے کمروں کی جانب بڑھ گیا تھا۔ وائل نے آنکھیں چھوٹی کر کے اسے بغور دیکھا۔ برآمدے میں لگے نیم چراغوں کی روشنی میں اس نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ سیف تھا۔ مگر رات کے اس پہر وہ یہاں کیا کر رہا تھا؟

آزاد منزل میں رہائش کے اصولوں میں ایک اصول یہ بھی شامل تھا کہ رات کے وقت کسی بھی لڑکے کا بالائی منزل پہ بنے دائیں جانب والے حصے میں داخلہ

ممنوع تھا۔ کیونکہ وہاں سب لڑکیوں کے کمرے تھے۔اس کے بہت سے بازیگروں کے آپس میں چکر تھے، لیکن وہ کسی کی بھی ذاتیات میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا۔ مگر اس کا ہر گز یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ ان سب کو جو جی چاہے کرنے کی کھلی چھوٹ دے دیتا۔ وہ اس کا گھر تھا کوئی عاشقی لڑانے کا اڈا نہیں۔

اس نے محتاط قدموں سے سیف کا پیچھا کیا۔

وہ ایک کمرے کے باہر رکا۔اس سے پہلے وہ دروازہ کھٹکھٹاتا،اس نے درشت آواز میں اسے پیچھے سے پکارا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

وہ چونک کے پلٹا۔اس کے تاثرات بتاتے تھے کہ اس کا دل اچھل کر حلق میں آن پہنچا ہے۔

"وہ....وہ میں...." وہ بری طرح ہکلایا۔"وہ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔"

"تو امیرہ سے کیا لوری سننے آئے تھے؟"اس کی تیکھی نظریں سیف پہ جمی رہیں۔

"یہ امیرہ کا کمرہ ہے؟" وہ انجان بنا۔ "مجھے لگا کتب خانہ ہے۔"

وہ اس کے پاس سے گزر کے واپس جانے لگا تو وائل نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے اسے روک لیا۔ پھر پورا اس کی طرف گھوم کے ایک جھٹکے میں اس چھوٹے قد کے لڑکے کو گریبان سے پکڑ کے اوپر اٹھایا۔ سیف کے چہرے پہ خوف نمایاں ہوا۔

"سیف بن خلیل میری ایک بات دھیان سے اپنے دونوں کان کھول کے سنو۔ کیونکہ مجھے اپنی باتیں دہرانے کی عادت نہیں ہے۔" نوکیلے لہجے میں چبا چبا کے کہنا شروع کیا۔

اس کی دھیمی مگر سرد آواز سے سیف کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

"اگر آئندہ مجھے رات کے پہر تمہارا سایہ بھی اس منزل پہ نظر آیا تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ خود کو نچلی منزل تک محدود رکھو۔"

سیف نے بہت سارا تھوک اندر نگلا اور سر کو ہاں میں جنبش دی۔

وائل نے ایک جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا۔وہ لڑکھڑاتا ہوا پیچھے بنے جنگلے سے ٹکرایا۔

امیرہ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ جلدی سے باہر آئی۔

"یہ آواز کیسی تھی؟"اس نے کھوجتی نظریں ادھر اُدھر دوڑائیں۔

امیرہ کو دیکھ کر وائل کی تیکھی نظریں ایک لمحے کے اندر اندر نرم نگاہ میں بدل گئیں۔چہرے کے پتھریلے تاثرات بھی مندمل ہو گئے۔

"مجھے تو کوئی آواز نہیں آئی۔"اس نے معصومیت سے کندھے اچکائے۔

پھر آنکھیں دکھاتے ہوئے سیف کی طرف مڑا۔"تمہیں کوئی آواز سنائی دی کیا سیف؟"

www.novelsclubb.com

سیف کو اپنی گردن خود بخود نفی میں ہلتی محسوس ہوئی۔

وائل نے اسے نظروں سے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا تو وہ چلا گیا۔

اس نے غور سے امیرہ کا چہرہ دیکھا۔اس کی آنکھیں ابھی تک متورم تھیں۔

"تم اسے دھمکیاں دے رہے تھے؟"امیرہ افسوس بھری حیرت سے بولی۔

"وہ راستہ بھٹک گیا تھا۔ میں بس اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔"

"جیسے مجھے تو اندازہ ہی نہیں ہے کہ تم کیسی رہنمائی کرتے ہو۔" امیرہ تاسف سے نفی میں سر ہلاتی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہ دروازہ بند کرنے لگی تو وائل نے جلدی سے آگے بڑھ کے دونوں ہاتھوں سے دروازہ پکڑ لیا۔

"میں تمہارا رہنما بھی بن سکتا ہوں۔" اپنائیت آمیز نرم لہجے میں بولا۔

امیرہ نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"اگر تم مجھے اپنا مسئلہ بتاؤ تو۔" اس نے بات مکمل کی۔

"مجھے کسی رہنما کی ضرورت نہیں ہے۔" نم سی آواز میں کہہ کر اس نے دونوں دروازے باہم ملا دیئے۔

www.novelsclubb.com

اس کا چہرہ چھپ گیا تو وائل نے گہرا سانس باہر نکالا اور دروازے پر سے ہاتھ ہٹا لیے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اگلی شام مغرب کی اذان ہوئے کافی گھڑیاں گزر گئیں تو سورج اُفق پہ اتر گیا اور

پیچھے گہرا اندھیرا چھوڑ گیا۔

وائل غزال پہنچا تو معمول کے مطابق لوگوں کا مجمع لگا تھا۔ ہر طرف گہما گہمی کا عالم تھا۔ ابھی تھوڑی دیر قبل ہی مغرب کی اذان ہوئی تھی جس کے بعد لوگ کھاپی کے دن بھر کی بھوک مٹاتے دکھائی دے رہے تھے۔

حریم اپنے کم عمر خادموں کے ہمراہ سب کو کھانا پروسنے میں مصروف تھی۔ اس نے مصروف دہ سے انداز میں چائے کی کیتلی ایک ادھیڑ عمر گاہک کے آگے رکھی تو وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے اس آدمی کے اوپر گر گئی۔

اس آدمی نے اسے معذرت کرنے کی مہلت دیئے بغیر ہی کرسی سے اٹھ کے پوری قوت سے ایک زوردار تھپڑ حریم کے منہ پہ دے مارا۔

قہوے خانے کے ہال میں یکدم سناٹا سا چھا گیا۔ سب لوگ کھانا روکے ان کی طرف متوجہ ہوئے۔

وائل کو اس آدمی سے ہمدردی ہوئی۔ اب اس کی کوئی بھی پچھلی نیکی اسے حریم بنتِ ہاشم کے قہر سے نہیں بچا سکتی تھی۔ وہ اسے سیدھا جہنم میں پہنچا کے ہی دم لینے

والی تھی۔

حریم نے ہاتھ گال پہ رکھے پھٹی پھٹی نگاہوں سے سامنے کھڑے آدمی کو دیکھا۔ اس کی نیم بھوری آنکھوں میں یکدم ڈھیر سارا پانی امڈ آیا۔اس نے پلکیں جھپکا کے اس آدمی کو غور سے دیکھا۔وائل کو اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دکھائی دی تھی۔

"میں معذرت خواہ ہوں۔"وہیں کھڑے جھکی نگاہوں سے معافی مانگ کے وہ باورچی خانے کی طرف بھاگ گئی۔

لوگوں نے سر جھٹکے اور واپس اپنے کھانے میں مصروف ہو گئے۔

وائل ہکا بکا سا جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔اس کو اپنے سامنے کے منظر پر یقین نہیں آرہا تھا۔عرصہ ہوا اسے چیزوں نے حیران کرنا چھوڑ دیا تھا مگر جو اس کی آنکھوں نے دیکھا وہ ناممکنات میں سے تھا۔حریم کی جگہ علینہ ہوتی تو اسے اس قدر جذباتی ردِ عمل پر حیرانی نہ ہوتی۔مگر وہ حریم تھی۔وہ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتی تھی۔

وہ اس آدمی کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک پُر تپش نظر اس پہ ڈالے باورچی خانے میں گیا۔اس نے دیکھا تہہ خانے والا دروازہ کھلا ہے۔وہ دھیرے سے زینے اتر کر نیچے آیا۔اس نے رسی کھینچ کے چراغ جلایا تو سارے میں گہری روشنی پھیل گئی۔

اس نے نظر ادھر اُدھر دوڑائی لیکن حریم وہاں کہیں بھی نہیں تھی۔اسے سسکیوں کی آواز آئی تو وہ چونکا۔وہ ان سسکیوں کا تعاقب کرتے میز کے کنارے تک آیا۔پھر جھک کر میز کے نیچے جھانکا۔

وہاں وہ بیٹھی تھی۔سر گھٹنوں میں دیئے مدھم آواز میں روتی۔

وہ انیس سالہ حریم نہیں تھی۔وہ وائل بِن آدم کا بچپن تھا۔اور شاید اس کا بھی۔

اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ آگے بڑھا کے اس کے سر پہ رکھا تو اس نے گردن اٹھا کے گیلی آنکھوں سے وائل کو دیکھا۔اور پھر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

"حریم باہر آؤ۔"اس کا ہاتھ پکڑ کے اسے نرمی سے باہر کھینچا۔وہ بنا کوئی مزاحمت

کیے میز کے نیچے سے نکل آئی۔

وائل نے کرسی کھینچ کے باہر نکالی اور دونوں کندھوں سے پکڑ کے اسے وہاں بٹھایا۔وہ ابھی تک اسی سُر میں رو رہی تھی۔اس نے میز پہ پڑے جگ میں سے پانی انڈیلا اور گلاس حریم کی طرف بڑھایا۔اس نے کانپتے ہاتھوں سے گلاس پکڑا اور ہچکیوں کے بیچ رک رک کے پانی پینے لگی۔

کافی دیر بعد اس نے گلاس وائل کی طرف واپس بڑھایا۔

"کون تھا وہ؟" گلاس پکڑتے ہوئے وائل نے سرسری انداز میں پوچھا۔

حریم کچھ نہیں بولی۔وائل نے مزید نہیں کریدا۔اسے سنبھلنے کا وقت دیا۔

وہ دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے اسے خاموشی سے دیکھتا رہا۔

لمحے بیتتے گئے۔حریم کی سسکیاں تھمتی گئیں۔لیکن آنسوں بھوری آنکھوں سے بدستور بہتے رہے۔

"میرا باپ۔" کافی دیر بعد جب وہ بولی تو اس کی آواز رندھی سی تھی۔

اسے اندازہ تھا کہ وہ آدمی اس کا باپ ہی ہو گا۔

"تمہارا باپ تو جبلین میں نہیں ہوتا؟ یہاں کیسے آیا؟"

"مجھے نہیں پتہ۔" وہ اضطرابی کیفیت میں بولی۔

وہ تقریباً اپنے سب بازیگروں کے ماضی سے باعلم تھا۔ لیکن اسے حریم کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا کیونکہ وہ اپنے دکھوں کے اشتہار نہیں لگاتی تھی۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ حریم کی ماں اسے ساتھ لیے اپنے بد سلوک شوہر کو چھوڑ کے قلبلار بھاگ آئی تھی۔ اور اس کا باپ پیچھے ہی کہیں رہ گیا تھا۔

"تمہیں لگتا ہے اس نے تمہیں پہچانا ہو گا؟"

"میرا نہیں خیال۔"

"تم کیا چاہتی ہو؟" اس نے دونوں ہاتھ کمر پہ رکھے۔

"میں اس آدمی کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"تمہاری رضامندی ہو تو والدین سے کہہ کر تمہارے والد محترم کو جنت الفردوس پہنچا دوں؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

حریم نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس کا دماغ چل گیا ہو۔

"قابلِ نفرت ہی سہی مگر باپ ہے وہ میرا۔" اکھڑ لہجے میں بول کر منہ پھیر لیا۔

"صرف پیدا کر دینے سے کوئی باپ نہیں بن جاتا حریم۔ماں جنم دے دے تو ماں کہلاتی ہے۔ لیکن باپ کو اپنا آپ ثابت کر کے دکھانا ہوتا ہے۔"

حریم نے سنا اَن سنا کر دیا۔اس کے لیے اس کا باپ یقیناً ایک تکلیف دہ موضوع تھا۔

وائل خاموش ہو گیا۔اسے حریم کے زخم کریدنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"حریم کہاں ہے؟"

"پتہ نہیں۔میرے نماز کے لیے جانے سے پہلے تک تو یہیں تھی۔"

سیڑھیوں کی طرف سے حرم اور امیرہ کی آوازیں بلند ہوئیں تو ان دونوں کی نظریں اس طرف گئیں۔

وہ دونوں آہستگی سے سیڑھیاں اترتے آ رہے تھی۔آخری سیڑھی پہ پہنچے تو دونوں نے متحیر نگاہوں سے وائل اور حریم کو دیکھا۔حریم کی لال آنکھیں دیکھ کے حرم تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

وائل دو قدم پیچھے ہو گیا۔اس نے بلاارادہ حریم پر کچھ زیادہ ہی شفقت نچھاور کر دی تھی۔

"حریم کیا ہوا ہے تمہیں؟ رو کیوں رہی ہو؟" گھٹنوں کے بل فکر مندی سے اس کے سامنے بیٹھا۔اسے دیکھ کے حریم کے آنسوں مزید تیزی سے بہنے لگے۔

"سیٹھ کیا ہوا ہے اسے؟" اس کے چہرے کا رُخ وائل کی طرف ہوا۔

امیرہ کے چہرے پہ بھی ڈھیر ساری تشویش اُمڈ آئی۔ مگر وہ حریم کی طرف نہیں گئی۔وہ سیدھا وائل کے روبرو آ کے کھڑی ہوئی۔

"اب کیا، کیا ہے تم نے وائل؟" ملامتی نظروں سے وائل کو دیکھتے قدرے اونچی آواز میں بولی۔

www.novelsclubb.com

امیرہ کی آنکھوں میں اپنے لیے بدگمانی دیکھنا وائل سے سہا نہیں گیا۔

"جانتا ہوں تمہاری نظروں میں، میں اس دنیا کا گھٹیا ترین انسان ہوں۔ لیکن ہر بار سب کے آنسوؤں کی وجہ میں نہیں ہوتا، امیرہ۔" خفا سی آنکھیں اس کی آنکھوں پہ مرکوز کرتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کے الفاظ ادا کیے۔

وائل کے سادہ سے لہجے میں کہے گئے اس جملے نے امیرہ پہ جیسے گڑھوں پانی گرا دیا۔

وہ ذرا پگھلی۔آنکھوں کی سختی ماند پڑی۔

"میرا وہ مطلب نہیں تھا۔"شرمندہ سی آواز۔

وائل نے آگے سے کوئی جواب نہیں دیا۔آنکھوں میں پُرافسوس تاثرات لیے ان تینوں کو تہہ خانے میں چھوڑ کے اوپر آگیا۔

کافی دیر وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے،دیوار سے ٹیک لگا کے،اس ادھیڑ عمر شخص کو تیکھی نظروں سے دیکھتا رہا۔

وہ بدقسمت انسان محض اپنی موجودگی سے حریم کی زندگی میں زہر گھول کے کھانے میں مشغول تھا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے ہماری شخصیت کو نکھارنا ہوتا ہے....ہمارا رہنما بننا ہوتا ہے....وہی ہمارے دلوں کا کانٹا بن جاتے ہیں؟

(وہ پورے چاند کی رات تھی۔پردوں سے گزر کے آتی منحوس چاندنی نے در و دیوار کو نیم منور کرر کھا تھا۔

آج وہ بچہ کسی پلنگ تلے نہیں بلکہ لکڑی کے ایک میز کے نیچے پیٹ کے بل لیٹا تھا۔اب وہ پہلے سے کافی بڑا ہو گیا تھا۔اور سمجھدار بھی۔آج وہ خوفزدہ ہو کے رو نہیں رہا تھا۔نہ ہی سرمئی آنکھوں سے کوئی آنسوں بہہ رہے تھے۔نہ ہی اس کی سانسیں اتھلی ہوئی تھیں۔اور نہ ہی سینے میں چھپا دل کانپ رہا تھا۔

اب اس میں ایک ایسی چیز آگئی تھی جسے شاید عزتِ نفس کہتے تھے۔

آج وہ میز کے نیچے ڈر کے نہیں چھپا تھا۔اسے عادت تھی اس آدمی کو ستانے کی۔ اس آدمی کو اسے جارحانہ انداز میں پیٹ کے مزا آتا تھا۔اور اس دنیا میں ہر چیز کی قیمت چکانی پڑتی ہے۔مفت میں تو بس سانس لیا جاتا ہے۔اس لیے وہ اسے بنا محنت کیے خود تک پہنچنے نہیں دیتا تھا۔

وہی مخصوص قدموں کی چاپ اس کی سماعت سے ٹکرائی۔اور پھر اس آدمی نے اسے ٹانگ سے پکڑ کے میز سے باہر نکالا۔وہ سنگ مرمر کے فرش پہ پھسلتا آسانی

سے باہر نکل گیا۔

وہی لچک دار رسی اس کے پیٹھ سے ٹکرائی تو اس نے اپنے دانت بازو پہ گاڑ لیا۔ انسان تھا۔ درد تو ہوتا تھا۔ لیکن چیخ و پکار کے کر اس ظالم شخص کو تسکین کا کوئی لمحہ نصیب ہونے نہیں دیتا تھا۔

اب اسے اس لچک دار رسی کا نام بھی پتہ لگ گیا تھا۔ اسے کوڑا کہتے تھے۔ جو چمڑے سے بنایا جاتا تھا۔ بیچ میں کہیں کہیں لوہے کے نوکیلے کیل بھی موجود ہوتے تھے۔

آدمی مسلسل اسے کوڑوں سے پیٹ رہا تھا۔ اسے اپنی کمر پہ خون کی بوندیں سرکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ سارا جسم دکھ رہا تھا۔ لیکن زیادہ تکلیف اس آدمی کے الفاظوں سے ہوتی تھی۔

"تم کیا سمجھتے ہو، تم اپنے ماں باپ سے مختلف نکل آؤ گے؟ او نہوں.... تم بھی ان کے جیسے فریبی اور خود غرض انسان ہی بنو گے۔" وہ ہمیشہ کی طرح نشے کی حالت میں دھت تنفر سے اپنے اندر کا زہر اگل رہا تھا۔ "تمہاری ماں ایک بے وفا،

دھوکے باز عورت تھی۔اور تمہارا باپ دوسروں کی خوشیوں پہ نقب لگانے والا۔ تم ان دونوں کی ناجائز اولاد ہو۔دو گھٹیا ترین لوگوں کے وجود کا حصہ۔تم ان سے بدتر تو بن جاؤ گے لیکن ان سے بہتر کبھی نہیں بن سکو گے۔وہ دونوں تو اتنے خود پرست ہیں کہ اپنی سگی اولاد سے بھی وفا نہیں نبھا پائے۔" وہ قہقہہ لگا کے ہنسا تھا۔

وہ یہ جملے کئی مرتبہ سن چکا تھا۔لیکن ہر بار ان سے ملنے والی تکلیف زہریلے سانپ کے ڈنک سے زیادہ شدید ہوتی تھی۔اور ہر مرتبہ اس آدمی کی زہر آلود تقریر سننے کے بعد وہ دل میں نئے سرے سے صرف ایک ہی عہد کرتا تھا کہ وہ اپنے ماں باپ سے مختلف بن کے دکھائے گا۔کبھی بھی ان دونوں جیسا نہیں بنے گا۔اپنے اعمال سے اپنی ماں کے پہلے شوہر کو غلط ثابت کرے گا۔

اس کا سوتیلا باپ ابھی تک اسی وحشیانہ انداز میں اسے پیٹ رہا تھا۔

ہمیشہ کی طرح اس رات بھی کوئی اسے بچانے نہیں آیا تھا۔وہ الگ بات تھی کہ اب اسے کسی نجات دہندہ کی نہ تو چاہ رہی تھی اور نہ ہی انتظار۔یہ امید برسوں پہلے ٹوٹ گئی تھی کہ کوئی اسے بچانے آئے گا۔لیکن اس کے اندر موجود ہمت اور حوصلے

کا شعلہ تھا جو چاند کی ہر چودھویں رات، بجھائے نہیں بجھتا تھا۔ نجانے اتنی برداشت اور سکت اسے کہاں سے ملی تھی؟ جنم دینے والے ماں باپ سے تو بالکل نہیں۔)

"حریم بات تو سنو...." کہیں دور سے آتی امیرہ کی صدا پہ اس نے گہرا سانس لیا اور ذہن کو اپنے ارد گرد کے ماحول سے واقف کروایا۔ وہ ابھی تک جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے دیوار سے ٹیک لگا کے حریم کے باپ ہاشم کو سپاٹ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اگلے لمحے حریم تیز رفتار میں اس کے قریب سے گزر کے گئی تھی۔ اس کی گردن ہنوز جھکی ہوئی تھی۔ ہمیشہ گردن اٹھا کے بااعتماد انداز میں چلنے والی حریم کی گردن آج جھکی ہوئی تھی۔

امیرہ بھی اس کے قریب سے گزری تھی۔ وہ ہال کے اس طرف بنے دروازے تک اس کے پیچھے گئی تھی۔ مگر جب وہ نہیں رکی تو امیرہ ہارمان کے پلٹ آئی۔

حرم اس کے پاس آ کے کھڑا ہوا۔

"حریم کا باپ کون ہے؟"اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔

اس نے نظر پھیر کے اس کی طرف دیکھا۔اس کی مٹھیاں بھنچیں ہوئی تھیں۔ آنکھوں میں قہر تھا۔اور نفرت بھی۔

(بہت دلچسپ!)وائل کے لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ بکھری۔

اس نے نظریں اس آدمی کی طرف موڑیں۔حرم کی سیاہ آنکھوں نے اس کی نظروں کا تعاقب کیا۔

"وہ۔"انگشت شہادت سے اس آدمی کی طرف اشارہ کر کے جیسے تصدیق چاہی۔

www.novelsclubb.com

وائل نے سر اثبات میں ہلایا۔

حرم سر کو ہلکی سی اوپر نیچے جنبش دیتا اس آدمی کی طرف گیا۔دائیں ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑا۔درمیان میں تین لمحوں کا وقفہ آیا۔اور پھر اس نے بائیں ہاتھ سے ایک زوردار مکا اس ادھیڑ عمر آدمی کے جبڑے پہ دھرا۔

وائل کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔

امیرہ جو ہال کے اس سرے سے واپس آ رہی تھی اس کی یہ حرکت دیکھ کے کنگ رہ گئی۔ ہاتھ بے اختیار پیالے کی صورت منہ تک گئے اور آنکھیں استعجاب سے پھیل گئیں۔

سب لوگ اپنا کھانا بھولے حرم کی طرف متوجہ تھے جو اس آدمی پہ مکوں کی اندھا دھن برسات کر رہا تھا۔

حرم بِن ہشام جو ہمیشہ زبان سے مسئلے سلجھانے کی باتیں کرتا تھا آج خود ہاتھا پائی پہ اتر آیا تھا۔ وائل کو اس کا یہ عمل قابلِ تحسین لگا تھا۔

"جاؤ جا کے اسے روکو۔" امیرہ اس کے قریب آ کے فکر مندی اور قدرے برہمی سے بولی تھی۔

لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ سرمئی آنکھوں میں استہزائیہ چمک لیے اور لبوں پہ لطف اندوز مسکراہٹ سجائے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ حرم بِن ہشام پہ فخر محسوس ہوا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

باقی آئندہ انشااللہ!

www.novelsclubb.com